الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خاں

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں
اور سمجھتے یہ ہیں کہ ——————
وہ بے ضرر پھولوں سے کھیل رہے ہیں

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

الرسالہ

اکتوبر ۱۹۸۱

شمارہ ۵۹

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دھلی ۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آپ کو کوئی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو خریداری کے کام کو صرف اس لئے چھوڑ دے کہ چیزوں کی قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ چیزوں کے دام بڑھ رہے ہیں۔ مگر بازار میں خریداروں کی بھیڑ میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

تاہم ایسے لوگ ہیں جنھوں نے صرف اس لئے الرسالہ کی خریداری بند کر دی ہے کہ اس کی قیمت میں گرانی کے سبب سے ایک روپیہ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں سے ہم کہیں گے کہ الرسالہ کا خریدنا کوئی بازار کا سودا خریدنے کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ دعوتِ حق کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے۔ اسلام کی ایک تاریخ وجود میں آرہی ہے۔ اب جو شخص چاہے اس تاریخ کا جزء بن جائے۔ اور جو شخص اس کا جزء بننے کے لئے تیار نہ ہو وہ خود سوچ لے کہ جس مہنگائی کو وہ اپنے دنیا کے معاملات میں پوری طرح گوارا کئے ہوئے تھا اسی مہنگائی کو آخرت کے معاملہ میں گوارا نہ کرنے کے لئے اس کے پاس خدا کے یہاں کیا جواب ہوگا۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دو سو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

خدا کو پانے والے

خدا کی زمین پر شاید ایسے لوگ موجود نہیں جنھوں نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جھوٹی عبادت کی دھوم ہر طرف نظر آتی ہے۔ مگر سچی عبادت ن نایاب ہے کہ امکان ہی کے درجہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کہیں موجود ہوگی۔

آج ساری دنیا میں دین اور اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر وہ انسان شاید خدا کی زمین پر کہیں پایا نہیں جاتا جس خدا کو اس طرح دیکھا ہو کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جو آن کو پڑھے تو اس کی روح پکار اٹھے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا، ورنہ میں الت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھے تو اس کا وجود اس دریافت سے سرشار ہو جائے کہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام تھا کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں س کو روشنی کے ابدی مینار کی طرح محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھے تو اس کو یہ احساس دنے لگے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے، جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارے اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جائے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لئے ایسی مکمل غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پیئے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں، اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

آہ، لوگ اپنے کو خدا سے کتنا قریب سمجھتے ہیں مگر وہ خدا سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر ان کے منھ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل و دماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز (Thrill) پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیبوں میں لئے پھرتا ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لئے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جا چکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں۔

سنتِ رسول

سنت عربی زبان میں طریقہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد خدا کا وہ پسندیدہ طریقہ ہے جو رسول کے ذریعہ انسان کو بتایا گیا۔ قرآن میں یہ لفظ شریعت خداوندی کے تمام طریقوں کے لئے آیا ہے - اسلامی معاشرت کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

يُرِيدُ اللَّهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوبَ عَلَيْكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (نساء ۲۶)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے واسطے بیان کرے اور تم کو ان لوگوں کا طریقہ بتا دے جو تم سے پہلے تھے اور تمہارے اوپر توجہ کرے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

اللہ نے جب دنیا بنائی تو اسی وقت یہ بھی طے کر دیا کہ اس دنیا کی کارکردگی کے لئے اس کا پسندیدہ طریقہ کیا ہوگا۔ اس طریقہ کو خدا نے بقیہ دنیا میں بزور اس طرح نافذ کر دیا کہ کوئی چیز اس سے ذرا بھی ہٹ نہیں سکتی۔ مگر انسان کو خدا نے اس کا پابند نہیں کیا۔ انسان کو سوچنے اور کرنے کی آزادی دے کر فرمایا کہ تم میں سے جو لوگ اپنی آزاد مرضی سے میرے پسندیدہ طریقہ پر چلیں گے ان کے لئے میرے یہاں جنت کے باغ ہیں اور جو لوگ اس سے انحراف کریں گے ان کے لئے دوزخ کی آگ۔

خدا کے اسی پسندیدہ طریقہ کو انسانوں کے سامنے واضح کرنے کے لئے خدا کے رسول آئے۔ رسول نے زبانی بھی بتایا اور برت کر عملاً بھی دکھا دیا کہ خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو رسول کی سنت کہا جاتا ہے۔ رسول کی سنت کا تعلق مسواک اور غسل جیسے معاملات سے بھی ہے اور ملی تعمیر اور اجتماعی اصلاح جیسے معاملات سے بھی۔ جو لوگ اللہ کے یہاں اس کے مقبول بندوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنے تمام معاملات میں رسول کی سنت کی پیروی کریں۔ اپنی زندگی کے کسی معاملہ کو اس سے آزاد یا غیر متعلق نہ سمجھیں۔

رسول کی اجتماعی سنتوں میں سے ایک سنت تدریج یا حقیقت پسندی ہے۔ یعنی نظریاتی معیاروں کے نفاذ میں حقیقی حالات و واقعات کی رعایت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی اصلاح کے تمام معاملات میں ہمیشہ تدریجی حکمت کے مطابق عمل کیا ہے۔ آج کل کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا طریقہ انقلابی (Revolutionary) نہیں تھا بلکہ ارتقائی (Evolutionary) تھا۔ حضرت عائشہ رضؓ ایک روایت میں اسی بات کو اس طرح بتاتی ہیں:

انما نزل اول ما نزل سورة من المفصل

قرآن میں سب سے پہلے مفصل سورتیں اتریں جن میں

فیھا ذکر الجنة والنار حتیٰ اذا ثاب الناس الی الاسلام نزل الحلال والحرام ولو نزل اول ما نزل لاتشربوا الخمر لقالوا لاندع الخمر ابدا ولو نزل لاتزنوا لقالوا لاندع الزنا ابدا

(بخاری باب تالیف القرآن)

جنت اور جہنم کا تذکرہ ہے۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام کے لئے ہموار ہو گئے تو حرام و حلال کی آیتیں اتریں۔ اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ شراب نہ پیو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہ چھوڑیں گے۔ اور اگر پہلے ہی اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہ چھوڑیں گے

رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہوا۔ اس کے بعد عرب کا مرکز قیادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں آگیا۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ آپ نے بیت اللہ سے متعلق شرعی احکام کا فوری نفاذ نہیں فرمایا۔ بلکہ جو کچھ کرنا تھا تدریج کے ساتھ کیا۔ فتح مکہ کے بعد اسلامی اقتدار قائم ہونے کے باوجود ۸ھ میں جو حج ہوا وہ بدستور قدیم جاہلی رواج کے مطابق ہوا۔ اس کے بعد ۹ھ میں اسلامی دور کا دوسرا حج اس طرح کیا گیا کہ مسلمانوں نے اپنے طریقہ پر حج کیا اور مشرکین نے اپنے طریقہ پر۔ پھر جب ۱۰ھ میں تیسرا حج آیا تو آپ کے حکم کے مطابق اس کو خالص اسلامی طریقہ پر انجام دیا گیا۔ یہی دورِ اسلامی کا تیسرا حج ہے جو اسلامی تاریخ میں حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔

طبعی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات سخت ناپسند تھی کہ مشرکین بیت اللہ میں آئیں اور اپنے مشرکانہ رواج کے مطابق حج کے مراسم ادا کریں۔ مگر اقتدار حاصل ہونے کے باوجود آپ نے شریعت کے نفاذ میں جلدی نہیں کی۔ فتح مکہ کے بعد دو سال تک آپ حج کی ادائگی کے لئے مکہ نہیں گئے۔ حج کا موسم آیا تو آپ نے فرمایا: مشرکین بیت اللہ میں آئیں گے اور ننگے ہو کر حج کریں گے۔ مجھے پسند نہیں کہ میں حج کروں جب تک یہ چیزیں ختم نہ ہو جائیں (انما یحضر المشرکون فیطوفون عراۃ فلا احب ان احج حتیٰ لایکون ذلک، تفسیر ابن کثیر، سورہ توبہ)

فتح مکہ کے بعد پہلے سال (۸ھ) میں مسلمانوں نے حج کیا مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف نہیں لے گئے۔ دوسرے سال (۹ھ) میں آپ نے مسلمان حاجیوں کا قافلہ حضرت ابو بکر کی قیادت میں مدینہ سے مکہ روانہ کیا۔ اس کے بعد قرآن میں یہ حکم اترا کہ مشرکین نجس ہیں، اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آئیں (توبہ ۲۸) چنانچہ آپ نے حضرت علی کو مکہ بھیجا اور حکم دیا کہ حج کے اجتماع میں گھوم گھوم کر یہ اعلان کر دیں کہ اِس سال کے بعد کوئی مشرک حج کے لئے نہ آئے اور اب سے کوئی شخص ننگی حالت میں کعبہ کا طواف نہ کرے (لا یحج بعد العام مشرک ولا یطوف بالبیت عریان) اس طرح تیسرے سال

جب دھیرے دھیرے شرک کا خاتمہ کر دیا گیا اس وقت آپ نے مکہ جاکر حج ادا فرمایا۔ یہی رسول اللہ علیہ وسلم کا آخری حج (حجۃ الوداع) تھا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احکام کے نفاذ میں کس طرح تدریجی حکمت کا لحاظ فرمایا ہے۔ حتیٰ کہ اقتدار پر قبضہ ملنے کے باوجود آپ نے تدریج کے اصول کو ترک نہیں کیا۔ خدا کے پیغمبر نے اپنے آپ کو روک لیا مگر مشرکین کو وقت سے پہلے روکنے کے لئے اقدام نہیں فرمایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت صرف وہی نہیں ہے جس کو عام طور پر لوگ "سنت" کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے سوا بھی رسول اللہ کی سنتیں ہیں۔ ان میں سے ایک سنت وہ ہے جس کو تدریج یا حقیقت پسندی کہا جاسکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیغمبر کی حیثیت سے ۱۳ سال رہے مگر آپ نے کبھی یہ نہ کیا کہ کعبہ کی بے حرمتی کے خلاف احتجاجی جلوس نکالیں۔ حتیٰ کہ فتح و غلبہ حاصل ہونے کے بعد بھی آپ نے بیہودہ مراسم کے خاتمہ کے لئے جلد بازی نہیں کی۔ طاقت ور ہونے کے باوجود آپ نے دو سال تک انتظار فرمایا اور تیسرے حج میں وہ تمام اصلاحات نافذ کیں جو آپ ملک میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔

تدریجی ڈھنگ پر عمل کرنے میں بہت سے فائدے ہیں جو کسی اور طریقے سے حاصل نہیں کئے جاسکتے۔

۱۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مطلوبہ نتیجہ تک پہنچنا یقینی ہو جاتا ہے۔ تدریجی طور پر آگے بڑھنا دوسرے لفظوں میں ایک ایک قدم کو سنبھالتے ہوئے اور مستحکم کرتے ہوئے آگے بڑھنا ہے۔ ایسا آدمی صرف جوش کے تحت میدان میں نہیں کود پڑتا بلکہ خارجی اسباب کی رعایت کرتے ہوئے حسب حالات اپنے مقصد کی طرف پیش قدمی کرتا ہے۔ اور جو شخص اپنے سفر میں اس حکمت کو ملحوظ رکھے وہ ضرور منزل پر پہنچ کر رہے گا۔

۲۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آدمی بے فائدہ نقصانات سے بچ جاتا ہے۔ جو شخص اچانک چھلانگ لگا کر مقصد تک پہنچنا چاہے اس کو غیر ضروری طور پر ایسی طاقتوں سے قبل از وقت لڑنا پڑ جاتا ہے جن سے مؤثر مقابلہ کے لئے وہ ابھی تیار نہیں ہو سکا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جان و مال کے ایسے نقصانات بھگتنے پڑتے ہیں جن کی تلافی مدتوں بعد بھی نہ ہو سکے۔

۳۔ تدریج کے ذریعہ روایات توڑے بغیر نظام تبدیل ہو جاتا ہے۔ سماجی زندگی میں روایات کی بے حد اہمیت ہے اور یہ روایات صدیوں میں بنتی ہیں۔ کسی نے بجا طور پر کہا ہے کہ ایک چھوٹی سی روایت بننے کے لئے بہت بڑی تاریخ درکار ہوتی ہے: It requires a lot of history to make a little tradition

جلد انقلاب لانے کے لئے اگر سماج میں ایجی ٹیشن اور مار دھاڑ کا ماحول قائم ہو جائے تو دوبارہ کام کا مزاج اور ایک دوسرے کے احترام کی روایات پیدا کرنے کے لئے کئی نسل کی جدوجہد درکار ہوگی۔

بیس سال بعد

۱۹۵۰ اور ۱۹۷۰ کے درمیان تقریباً ۲۰ سال تک جاپان کا حال یہ تھا کہ وہ صنعتی ٹکنالوجی کی اعلیٰ قسموں کو مغربی ملکوں سے حاصل کرتا تھا۔ کبھی ادھار، کبھی مانگ کر اور کبھی خرید کر۔ مگر آج جاپان کی اقتصادیات اپنی ذاتی بنیادوں پر قائم ہیں۔ جاپان اس حیثیت میں ہوگیا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی مصنوعات کو بلکہ اپنی صنعتی مہارت کو بھی دوسرے ملکوں میں بھیج سکے۔

صنعت میں اپنی ترقی یافتہ تکنکی صلاحیت کی بنا پر اس کو یہ موقع مل رہا ہے کہ وہ دوسرے ملکوں کی مدد کرکے ان کی دوستی حاصل کرسکے۔ مختلف ملکوں کی بڑی بڑی اسکیموں کا ٹھیکہ لے کر ان سے تجارتیں کرے۔ جاپانی ماہرین آج تھائی لینڈ میں آب پاشی کے جدید منصوبوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ وہ سنگاپور میں کمپیوٹر پروگرام کی تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ جنوبی کوریا اور چین میں فولاد کے کارخانے تعمیر کر رہے ہیں۔ وہ شرق اوسط میں پٹرو کیمیکل صنعتیں قائم کر رہے ہیں۔

جاپانیوں نے ابتداءً فولاد بنانا امریکیوں سے سیکھا تھا، اب وہ اس ہنر کو مزید ترقی دے کر اس کو خود امریکہ کو برآمد کرنے کے قابل ہوگئے ہیں۔ جاپان جو کسی وقت امریکہ کا شاگرد تھا، اب اس نے کئی چیزوں، خاص طور پر مواصلات (کمیونی کیشن) اور الکٹرانکس میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ امریکہ خود اپنے فوجی اہمیت کے شعبوں میں جاپان کی تکنکی مدد حاصل کرنے کے لئے جاپان سے معاہدہ کر رہا ہے۔ شاگرد اس قابل ہوگیا ہے کہ اپنے استاد کو سبق دے سکے۔

جاپان کے اس تجربہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس ۱۱ جون ۱۹۸۱) نے لکھا ہے ——— "ٹکنالوجی کا بہاؤ پہلے جاپان کے اندر تھا، اب اس کا بہاؤ جاپان کے باہر ہے:

Now the flow is out instead of in

جاپان ۲۰ سال تک صنعتی مغلوبیت پر راضی رہا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج اس کو صنعتی غلبہ کا مقام حاصل ہوگیا۔ اگر وہ اول دن سے غلبہ پر اصرار کرتا تو اس کے حصہ میں صرف یہ آتا کہ اس کی مغلوبیت کبھی ختم نہ ہو۔ ہر پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ ہر بلندی کے لئے کچھ پستی کو گوارا کرنا ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا قانون ہے۔ جو لوگ دنیا کے اس قانون کے ساتھ موافقت کریں وہی خدا کی اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ اس قانون کے ساتھ موافقت کرنے کے لئے تیار نہ ہوں ان کے حصہ میں صرف یہ آتا ہے کہ وہ ناکام ہوکر رہ جائیں اور اس کے بعد بے فائدہ طور پر دوسروں کو اپنی بربادی کا جھوٹا الزام دیتے رہیں۔

طاقت کا راز

عالمی سطح کے کھلاڑی اکثر یکساں جسمانی قوت کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کو تربیت بھی یکساں معیار کی ملتی ہے۔ پھر ان میں ہار جیت کا سبب کیا ہوتا ہے۔ جو شخص جیتتا ہے وہ کیوں جیتتا ہے اور جو ہارتا ہے وہ کس بنا پر ہارتا ہے۔ یہ سوال پچھلے تین سال سے امریکہ کے سائنس دانوں کی ایک جماعت کے لئے تحقیق کا موضوع بنا ہوا تھا، اب انھوں نے تین سال کے بعد اپنی تحقیق کے نتائج شائع کئے ہیں۔

ان سائنس دانوں نے عالمی سطح کے بہترین کشتی لڑنے والوں (Wrestlers) پر تجربات کئے۔ انھوں نے ان کی عضلاتی طاقت اور ان کی نفسیات کا بغور مشاہدہ کیا۔ انھوں نے پایا کہ عالمی مقابلوں میں جیتنے والے پہلوانوں اور ہارنے والے پہلوانوں میں ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ مگر یہ فرق جسمانی نہیں بلکہ تمام تر نفسیاتی ہے۔ یہ دراصل پہلوان کی ذہنی حالت (State of Mind) ہے جو اس کے لئے ہار یا جیت کا فیصلہ کرتی ہے۔ ماہرین نے پایا کہ ہارنے والے کے مقابلہ میں جیتنے والا زیادہ با اصول اور قابو یافتہ شخص (Conscientious and and in Control) ہوتا ہے۔ ان کی رپورٹ کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

Losers tended to be more depressed and confused before competing, while the winners were positive and relaxed

تجربہ میں پایا گیا کہ ہارنے والے کھلاڑی مقابلہ سے پہلے ہی بددل اور پریشان تھے، جب کہ جیتنے والے پُر اعتماد اور مطمئن تھے (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ جولائی ۱۹۸۱)

یہی بات زندگی کے وسیع تر مقابلہ کے لئے بھی درست ہے۔ زندگی کے میدان میں جب دو آدمیوں یا دو گروہوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو کامیاب ہونے یا نہ ہونے میں اصل فیصلہ کن چیز یہ نہیں ہوتی کہ کس کے پاس مادی طاقت یا ظاہری ساز و سامان زیادہ ہے اور کس کے پاس کم۔ بلکہ اصل فیصلہ کن چیز قلب اور دماغ کی حالت ہوتی ہے، جس کے اندر قلبی اور ذہنی اوصاف زیادہ ہوتے ہیں وہ کامیاب ہوتا ہے اور جس کے اندر یہ اوصاف کم ہوتے ہیں وہی ناکام ہو جاتا ہے خواہ اس کے پاس ظاہری اسباب کی کثرت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

مقصد کی صحت کا یقین، تضاد فکری سے خالی ہونا، نظم و ضبط کو کبھی نہ چھوڑنا، ہیجان خیز لمحات میں بھی ٹھنڈے دماغ سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت، جذبات پر پوری طرح قابو رکھنا، ہمیشہ سوچے سمجھے اقدام کے تحت عمل کرنا، یہ تمام قلب و دماغ سے تعلق رکھنے والی چیزیں ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو زندگی کے معرکہ میں ہمیشہ فیصلہ کن ہوتی ہیں۔

اشتعال نہیں

ایک صاحب ہیں۔ وہ بظاہر عام حلیہ میں رہتے ہیں مگر مزاج کے اعتبار سے بہت دیندار ہیں۔ وہ ایک تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور قرآن و حدیث کے موضوعات پر کئی کتابیں لکھی ہیں۔

ایک روز نماز جمعہ کے بعد مسجد میں ان کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوئی۔ موصوف کے ساتھی نے ان کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ فلاں صاحب ہیں اور وہ قرآن و حدیث پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ بزرگ نے موصوف کی طرف دیکھا تو انھوں نے پایا کہ وہ قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ سر پر گاندھی ٹوپی ہے۔ داڑھی بھی ایک مشت کے ناپ سے کم ہے۔ بزرگ نے یہ دیکھ کر فرمایا:

صورت سے تو ایسا معلوم نہیں ہوتا

بزرگ کی زبان سے یہ توہین آمیز تبصرہ سن کر موصوف کو غصہ آگیا۔ تاہم انھوں نے برداشت کر لیا۔ وہ ایک لمحہ چپ رہے اور اس کے بعد بولے:

آپ کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کبھی گنہ گاروں سے بھی اپنا کام لے لیتے ہیں

یہ ٹھنڈا جواب مذکورہ بزرگ کے لئے اتنا سخت ثابت ہوا کہ اس کے بعد وہ کچھ بول نہ سکے اور خاموشی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشتعال کے وقت آدمی کو کیسا جواب دینا چاہئے۔ جب بھی کوئی آدمی آپ پر تنقید کرتا ہے، آپ کے خلاف کوئی سخت بات کہہ دیتا ہے تو آپ کے بدن میں آگ جاتی ہے۔ آپ چاہنے لگتے ہیں کہ اس کو بھسم کر دیں جس طرح اس نے آپ کو بھسم کیا ہے، مگر یہ طریقہ شیطانی طریقہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ اس کڑواہٹ کو پی جائیں۔ جو جھٹکا آپ پر لگا ہے اس کو دوسرے کے اوپر ڈالنے کے بجائے خود اپنے آپ پر سہہ لیں جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو ایک نئی قوت حاصل ہوگی۔ آپ اس حکمت کو جانیں گے کہ کڑوے الفاظ کا جواب میٹھے الفاظ سے دینا زیادہ سخت جواب ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اشتعال کے وقت جو شخص صبر کرلے اور سوچ سمجھ کر بولے وہ زیادہ طاقتور انداز میں اپنی بات کہنے کے لائق ہو جاتا ہے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ مشتعل الفاظ کا جواب ٹھنڈے الفاظ سے دے اور ٹھنڈک آگ کو زیادہ بجھانے والی ہے۔ وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنے مخالف کو معاف کر دے اور معاف کر دینا یقیناً سب سے بڑا انتقام ہے۔

کام کا شوق

ایک تعلیم یافتہ شخص ایک مصروف ادارہ میں ہمہ وقتی ملازم تھے۔ اسی کے ساتھ وہ ایک انگریزی اخبار میں سب اڈیٹر تھے۔ وہ مذکورہ ملازمت کی ذمہ داریاں پوری طرح نبھاتے تھے اور اسی کے ساتھ اخبار کی ادارتی ذمہ داریاں بھی۔ کسی شخص نے ان سے پوچھا آپ اتنا زیادہ کام کرتے ہیں۔ آپ کو وقت کیسے ملتا ہے۔ انھوں نے جواب دیا۔ وقت کوئی چیز نہیں، یہ صرف دلچسپیوں کی کارگزاری ہے:

Time is nothing but it is a **function** of interests

یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی کام کی تکمیل کے لئے اصل اہمیت وقت کی نہیں، اصل اہمیت دل چسپی کی ہے، یہ آدمی کی دل چسپی ہے جو اس سے کسی کام کو پورا کرا دیتی ہے۔ واقعی لگن اور شوق ہو تو کم وقت میں آدمی بہت سا کام کرے گا۔ اور اگر شوق اور لگن نہ ہو تو زیادہ وقت بھی اس کے لئے تھوڑا بن جائے گا۔

ایک شخص کے پاس ملک کے باہر سے ایک پیش کش آئی۔ وقت صرف تین ہفتہ کا تھا، جب کہ اس کے پاس ابھی تک پاسپورٹ بھی نہیں تھا۔ موجودہ زمانہ میں بیرونی سفر کے لئے بہت سے قانونی تقاضے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ بظاہر وقت پر سفر کرنا انتہائی دشوار تھا۔ مگر اس نے رات دن ایک کر کے سارا کام پورا کر لیا اور ٹھیک تاریخ پر وہ ہوائی جہاز پر بیٹھ کر مطلوبہ ملک کو پرواز کر رہا تھا۔

دوسری طرف اسی قسم کا موقع ایک اور شخص کے لئے پیدا ہوا۔ وہ شہر سے دور دیہات میں تھا، اس نے اپنے ایک رشتہ دار کو جو شہر میں رہتے تھے، خط لکھا کہ میرے لئے شہر میں آنا مشکل ہے۔ آپ میرا یہ کام کرا دیجئے اور اس سلسلہ میں جو پیسہ خرچ ہوگا وہ سب میرے ذمہ ہوگا۔ رشتہ دار نے جواب دیا کہ اچھا میں کوشش کروں گا۔ مذکورہ شخص ان کے اطمینان پر رہ گیا۔ اس کے پاس پورے دو مہینے کا وقت تھا مگر اس کا کوئی کام نہیں ہوا اور وہ باہر نہ جا سکا۔ آخر میں مذکورہ رشتہ دار کا پیغام ملا کہ فلاں وجہ پیش آگئی اس وجہ سے میں تمھارا کام نہ کر سکا۔ یہ زبانی پیغام تاخیر سے اس وقت پہنچا جب کہ وقت گزر چکا تھا ——

پہلے شخص نے اپنا کام سمجھ کر دل چسپی لی تو اس نے کم وقت کے باوجود کام کو پورا کر لیا۔ دوسرے شخص نے اپنے کام کی طرح دلچسپی نہیں لی اس لئے معمولی باتیں اس کے لئے عذر بن گئیں اور زیادہ وقت کے باوجود وہ کام کو انجام نہ دے سکا

آدمی کو جب کام کا شوق ہو تو اس کی عقل کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مقصد کو حاصل کرنے کی تڑپ اس کی قوتِ عمل کو بڑھا دیتی ہے۔ وہ اس کی خاطر ہر قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دنوں میں وہ کام کر لیتا ہے جس کو دوسرا شخص ہفتوں اور مہینوں میں بھی نہ کر سکے۔

کام ہے، کام کرنے والے نہیں

مہاراشٹر کا ایک نوجوان رامیش دھوبی (۲۲ سال) بے روزگاری سے سخت پریشان تھا۔ مایوسی نے اس کی زندگی اس کی نظر میں بے قیمت بنا دی تھی۔ آخر کار ایک روز وہ موہدی اسٹیشن پہنچا۔ "میرے اس ہاتھ کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے دنیا میں کوئی کام نہ ہو" یہ احساس اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اتنے میں اس کو ایک ٹرین آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ریلوے لائن کے کنارے کھڑا ہو گیا اور جیسے ہی ٹرین سامنے آئی اس نے اپنے دونوں ہاتھ پہیہ اور پٹری کے بیچ میں ڈال دئے۔ انجام ظاہر تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کٹ کر اس کے جسم سے الگ ہو گئے۔

مسافروں نے جب اس کا حال دیکھا تو اس کو لے کر فوراً اسپتال پہنچے اور اس کو ڈاکٹروں کے حوالے کیا۔ رامیش دھوبی سے پوچھا گیا کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔ اس نے جو جواب دیا وہ انگریزی رپورٹنگ (ٹائمس آف انڈیا ۱۴ اگست ۱۹۸۱) میں ان الفاظ میں نقل ہوا ہے:

My hands are useless as I can find no work,
and living is shameful without work

جب میرے لئے کوئی کام نہیں تو میرے ہاتھ بھی بے کار ہیں۔ کام کے بغیر زندگی رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اخبار کی یہ خبر میں نے پڑھ کر ختم کی تھی کہ ایک صاحب کمرہ میں داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے حالات بتاتے ہوئے کہا کہ میرے پاس کافی کھیت ہیں اور نہر ہونے کی وجہ سے آب پاشی کا معقول انتظام ہے۔ محنت اور ذمہ داری کے ساتھ کام کیا جائے تو بآسانی ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہے۔ اب تک میں خود کرتا رہا۔ مگر اب میرے پاس وقت نہیں۔ اور کوئی ایسا قابل اعتماد آدمی نہیں ملتا جس کے حوالے میں اپنا یہ کام کر سکوں۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ میں اپنی زمینوں کو بیچ دوں۔

آج کی دنیا میں جس طرح بے شمار لوگ بے روزگاری سے پریشان ہیں۔ اسی طرح یہ بھی واقعہ ہے کہ بے شمار لوگ اس مسئلہ سے دوچار ہیں کہ ان کے پاس کام ہیں مگر ایسے آدمی نہیں ملتے جو سلیقہ کے ساتھ کام کو سنبھال سکیں۔

ان دونوں واقعات کو ملا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں کام کی کمی نہیں بلکہ کام کرنے والوں کی کمی ہے۔ جو لوگ بے روزگار ہیں اگر وہ اپنے اندر صرف دو صلاحیت پیدا کر لیں تو روزگار خود انھیں تلاش کرے گا نہ کہ وہ روزگار کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھریں۔ وہ دو صلاحیتیں ہیں ——— محنت اور دیانت داری۔

حالات کی رعایت

۱۹ جولائی ۱۹۸۱ کو دہلی ۔ احمد آباد میل حسب معمول اپنے وقت پر روانہ ہوئی۔ مگر مہسانہ اسٹیشن پر وہ چالیس منٹ لیٹ ہوگئی۔ ٹرین جب مہسانہ سے آگے بڑھی تو ڈرائیور نے اس کو عام رفتار سے زیادہ تیز دوڑانا شروع کیا تاکہ وہ اپنے مقررہ وقت پر احمد آباد پہنچ جائے۔ ٹرین ڈنگروا سے دو کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھی کہ ڈرائیور نے دیکھا کہ آگے کی پٹری میں کچھ فش پلیٹیں غائب ہیں۔ اس نے فوری طور پر بریک لگایا تاکہ ٹرین کو روک کر حادثہ سے بچائے۔ مگر تیز دوڑتی ہوئی ٹرین اچانک بریک لگنے سے بے قابو ہوگئی۔ انجن اور اس کے ساتھ لگی ہوئی ۱۲ بوگیاں پٹری سے اچھل پڑیں اور پوری گاڑی اپنی پٹری چھوڑ کر کنارے کے کھڈ میں جا گری۔ کافی لوگ مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ حالات کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کی گاڑی تیز دوڑانا شروع کر دیں۔ کیونکہ اس دنیا میں صرف آپ ہی نہیں ہیں بلکہ دوسرے بھی ہیں۔ یہاں صرف آپ برسرعمل نہیں ہیں بلکہ دوسرے بھی برسرعمل ہیں۔ ایسی ایک دنیا میں اسی شخص یا قوم کا سفر کامیاب ہو سکتا ہے جو خارجی حالات کو اچھی طرح سمجھے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنی گاڑی کو آگے بڑھائے۔ اگر یہ حکمت نہ برتی جائے تو راستہ میں کوئی بھی غیر موافق واقعہ پیش آکر ہمارے سارے منصوبہ کو خاک میں ملا دے گا۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں نے بہت سے بڑے بڑے اقدامات کئے اور سب ناکام ہوتے چلے گئے۔ اس ناکامی کی توجیہہ ہر ایک کے پاس صرف ایک ہے: "فلاں کی سازش نے ان کے منصوبہ کو ناکام بنا دیا" مگر یہ عذر صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ مذکورہ اقدام میں حالات کی پوری رعایت شامل نہ تھی۔ خوش فہمی کے تحت اپنی گاڑی دوڑا دی گئی اور اس بات کا اندازہ نہیں کیا گیا کہ آگے کی پٹری پر ایک دشمن موجود ہے جو "فش پلیٹ" نکال کر ہماری گاڑی کو الٹنے کا خفیہ منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔

"گاڑی"، خواہ مکمل طور پر آپ کی ہو مگر جس "سڑک" پر آپ کو اپنی گاڑی دوڑانی ہے وہ مکمل طور پر آپ کی نہیں۔ یہ حقیقت خواہ کسی کے لئے کتنی ہی تلخ ہو مگر بہرحال وہ ہے اور یہ ممکن نہیں کہ اس کو نظر انداز کر کے کوئی شخص اس دنیا میں کامیاب ہو سکے۔

جو لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے اپنی زندگی کی گاڑی دنیا کی سڑک پر دوڑائیں ان کے حصہ میں کبھی منزل نہیں آتی۔ واحد چیز جو اس دنیا میں ان کے لئے مقدر ہے وہ یہ کہ وہ اپنے ہر اقدام کے بعد ناکام ہوں اور پھر کسی نہ کسی "سازش" کا انکشاف کر کے اس کے خلاف فریاد کرتے رہیں۔

الٹا رخ

ایک مولوی صورت آدمی ایکسپریس ٹرین کے فرسٹ کلاس میں داخل ہوا۔ اس کے سوا کیبن میں تین اور مسافر تھے اور تینوں پورے معنوں میں "مسٹر" تھے۔ مذکورہ مسافر کے سادہ لباس اور اس کے چہرے کی شرعی داڑھی نے اس کو اس ماحول میں اجنبی بنا دیا۔

کئی اسٹیشن گزر گئے۔ تینوں مسٹر آپس میں باتیں کرتے رہے۔ مگر کسی نے مولوی کی طرف رخ نہیں کیا۔ مولوی شاید ان کے نزدیک اس قابل نہ تھا کہ اس سے بات کی جائے۔ آخر مولوی نے یہ کیا کہ اگلے اسٹیشن پر ایک انگریزی اخبار خریدا اور اس کو ہاتھ میں لے کر الٹی طرف سے دیکھنے لگا۔ مسٹر صاحبان یہ منظر دیکھ کر ہنس پڑے۔ ایک شخص نے دوسرے سے انگریزی میں کہا: اس مولوی کو دیکھو، الٹی طرف سے اخبار پڑھ رہا ہے۔ دوسرا بولا: یہ شخص جب انگریزی نہیں جانتا تو اس کو خواہ مخواہ انگریزی اخبار خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔

مسٹر صاحبان کو یقین تھا کہ مولوی ان کی گفتگو کو سمجھ نہیں رہا ہے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ "مولوی" ان سے زیادہ انگریزی جانتا ہے۔ اس کے بعد مولوی ان کی طرف مخاطب ہوا اور انگریزی زبان میں مسلسل بولنا شروع کیا۔ اس نے انگریزی میں کہا: کیا یہ کوئی قانونی جرم ہے کہ اخبار کو الٹی طرف سے پکڑا جائے۔ آخر آپ نے کیسے سمجھ لیا کہ میں انگریزی زبان نہیں جانتا۔ اس کے بعد اس نے گفتگو کو دوسری طرف موڑ دیا۔ اس نے کہا: ایک اخبار کو الٹی طرف سے پکڑنا آپ کو اتنا عجیب معلوم ہوا۔ مگر معاف کیجئے آپ اور آپ جیسے بے شمار لوگ پوری زندگی کو الٹی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔

زندگی کو غیر مادی مقصد کی طرف سے پکڑنا چاہئے اور لوگ اس کو مادی مقاصد کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ اس کو روح کی طرف سے پکڑنا چاہئے اور لوگ اس کو جسم کی طرف سے پکڑے ہوئے ہیں۔ زندگی کو دیکھنے کا صحیح رخ یہ ہے کہ اس کو آخرت کی طرف سے دیکھا جائے۔ مگر لوگ اس کو دنیا کی طرف سے دیکھ رہے ہیں۔ ہمارا سب سے اہم مسئلہ موت ہے مگر تمام لوگ زندگی کو سب سے اہم مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ خدا کی نظر سے انسان کو دیکھا جائے مگر آج سارے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ انسان کی نظر سے خدا کو دیکھ رہے ہیں۔

اخبار کا الٹا رخ ہر ایک کو دکھائی دے رہا ہے اور زندگی کا الٹا رخ کسی کو نظر نہیں آتا۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو اپنے کو دیکھنے والا سمجھتے ہیں مگر ان کو وہی چیز دکھائی نہیں دیتی جس کو انھیں سب سے زیادہ دیکھنا چاہئے۔

کچھ کام نہ آئے گا

ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ ۲۰ سال پہلے وہ معمولی میکنک تھے۔ اب وہ تقریباً دو درجن مشینوں کے مالک ہیں۔ ان کے کئی کارخانے چل رہے ہیں۔ میں نے ایک ملاقات میں کہا: آپ نے ماشاء اللہ اپنے کاروبار میں کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے خوشی اور اعتماد کے لہجہ میں جواب دیا: اتنی کمائی کرلی ہے کہ بچے کچھ نہ کریں تب بھی وہ سو سال تک آرام سے کھاتے رہیں گے۔

یہ ایک انتہائی مثال ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا یہی حال ہو رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں یہی یقین لئے ہوئے ہے کہ اس نے اپنے معاملات کو درست کرلیا ہے۔ اسے اب کسی خطرہ کی ضرورت نہیں۔ کم از کم "سو سال" تک تو بالکل نہیں۔

کوئی اپنے بڑوں کو خوش کرکے مطمئن ہے۔ کسی کو یہ فخر ہے کہ اس نے اپنے قانونی کاغذات کو پکا کرلیا ہے۔ کسی کو اپنے قابل اعتماد ذریعۂ معاش اور اپنے بنک بیلنس پر ناز ہے۔ کوئی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنی دادا گیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تو جس کے پاس ہے وہ اس سے خوشامد اور مصالحت کا تعلق قائم کرکے سمجھتا ہے کہ اس نے بھی ایک چھتری حاصل کرلی ہے، اب اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔

مگر بھونچال جب آتا ہے تو اس قسم کے تمام بھروسوں کو باطل ثابت کردیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کردیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔ بھونچال یہ یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں آدمی کس قدر بے بس ہے۔

یہ بھونچال خدا کی ایک پیشگی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ ہر ایک کے لئے بالآخر کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کردیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہوجاتا ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل عاجز ہے۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ بے بسی کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کرسکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے اربوں اور کھربوں گنا زیادہ سخت ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کی پناہ لئے ہوئے تھے۔

یہ جہنمی قافلے

"ہر آدمی جنت کی تلاش میں ہے مگر ہر آدمی اپنی جنت کو دوزخ میں تلاش کر رہا ہے" میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "لوگ کانٹوں میں پھول کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ اپنی زندگی کو کھنڈر کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت جلد ان کے لئے ایک شان دار محل کھڑا ہونے والا ہے"۔

ہر آدمی اپنی زندگی کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی تجارت اور ملازمت کے میدان میں محنت کر رہا ہے۔ کوئی قیادت کے میدان میں اپنا نام اونچا کرنے کے لئے سرگرم ہے۔ کسی کا دماغ خوبصورت الفاظ کا کارخانہ بنا ہوا ہے تاکہ وہ عوام کی بھیڑ کو زیادہ سے زیادہ اپنے گرد جمع کر سکے۔ ہر آدمی اپنے ذہن میں اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب لئے ہوئے ہے اور ہر آدمی اپنے خواب کو واقعہ بنانے میں رات دن مصروف ہے۔ مگر لوگوں سے قریب ہو کر ان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اپنے خوابوں کی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے پاس عمل غیر صالح کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔

آدمی اپنے رشتہ داروں کے حقوق سے بے پروا ہو کر اپنے بچوں کا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دکھ پہنچا کر دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کر کے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔

خدا نے اپنی دنیا میں انسان کے لئے وہ سب کچھ رکھا ہے جو وہ چاہتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر اچھی چیز کو پانے کا ذریعہ اچھا عمل ہے ——— خدا کا انعام ان لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ جو خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کے اوپر اپنی زندگیوں کو اٹھائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

تدریجی ارتقاء کا ثبوت نہیں

حالیہ تحقیقات نے ارتقار کے مفروضہ کو عملی طور پر بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔ مثلاً متحجرات (Fossils) کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نظریۂ ارتقار کا یہ مفروضہ مشاہدات کے مطابق نہیں ہے کہ زندگی کی ایک نوع کروروں سال میں ہلکی ہلکی تبدیلی سے دوسری نوع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ڈارونزم میں یہ فرض کیا گیا تھا کہ لومڑی کی نسلوں میں رفتہ رفتہ تبدیلیاں ہوئیں جس کے نتیجہ میں ساٹھ ملین سال کے بعد لومڑی نے گھوڑے کی صورت اختیار کر لی۔ مگر تازہ دریافتیں بتاتی ہیں کہ زندگی کی انواع میں تبدیلی (اگر اس کو تبدیلی کا نام دیا جائے) بالکل اچانک ہوتی ہے۔ یعنی "لومڑی" بالکل اچانک ایک ہی نسل میں گھوڑا بن جاتی ہے۔ زمین کی تہوں میں قدیم زمانہ کے حیاتیاتی آثار جو پتھریلی ہڈیوں یا ڈھانچوں کی صورت میں دفن ہیں وہ قدیم مفروضہ کی مطلق تصدیق نہیں کرتے۔

ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے پروفیسر اسٹیفن جے گولڈ (Stephen Jay Gould) نے جدید شواہد کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ متحجرات کے ریکارڈ کے مطابق انواع حیات کروروں سال تک بغیر بدلے ہوئے ایک حالت پر باقی رہتی ہیں اور پھر بالکل اچانک ایک نوع غائب ہو کر دوسری نوع سامنے آجاتی ہے جو بنیادی طور پر پہلی سے مختلف مگر واضح طور پر پہلی کے مشابہ ہوتی ہے:

> For millions of years species remain unchanged in the fossil record, and then they abruptly disappear to be replaced by something substantially different but clearly related.
> The Sunday Times (London) 8 March 1981

متحجرات کے مطالعہ میں ایک نوع کروڑوں سال تک بالکل یکساں حالت میں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعد ایسے فاسل ملتے ہیں جو بتاتے ہیں کہ اچانک ایک نوع سامنے آگئی۔ اس طرح تدریجی تبدیلی کا نظریہ سراسر باطل ثابت ہو جاتا ہے۔ تاہم فاسل کے مطالعہ سے جو بات معلوم ہوئی ہے وہ صرف ایک قسم کے جاندار کے متحجر ڈھانچہ کے بعد اچانک دوسری قسم کے جاندار کے متحجر ڈھانچہ کا ملنا۔ یہ سوال ابھی بدستور حل طلب ہے کہ نئی نوع پچھلی نوع کے بطن سے نکلی یا آزادانہ طور پر وجود میں آئی جس طرح زمین کا پہلا جاندار آزادانہ طور پر وجود میں آیا تھا۔ ارتقار کے حامیوں کا خیال تھا کہ پہلے جاندار کے متعلق اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ اچانک پیدا ہو گیا تو دوسری تمام قسم کے جانداروں کی پیدائش ارتقائی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ مگر اب حقائق یہ ماننے پر مجبور کر رہے ہیں کہ جس طرح پہلا جاندار "اچانک" پیدا ہوا اسی طرح جانداروں کی دوسری تمام قسمیں بھی "اچانک" پیدا ہوئی ہیں۔ ارتقار کا نظریہ جس طرح پہلے جاندار کی تشریح میں ناکام تھا اسی طرح وہ بعد کے جانداروں کی تشریح میں بھی ناکام ہو رہا ہے۔

CONVERSION TO GOD

There wasn't much to agree on when two of Britain's most eminent scientists began researching into the origin of life. But on one point they were both quite clear — that the notion of 'Creator' is inconsistent with science. Today, Professor Sir Fred Hoyle, an agnostic of Christian background and Professor Chandra Wickramasinghe, an atheist Buddhist are changed men. They believe. What convinced both men were calculations they each did independently into the mathematical chances of life starting spontaneously. Each found that the odds against the spark of life igniting accidentally on Earth were staggering — in mathematical jargon '10 to the power of 40,000.' If you write down the figure '1' and add 40,000 noughts after it, you have the figure. "That number is such an imponderable in the universe that I am 100 per cent certain that life could not have started spontaneously on Earth," says Wickramasinghe' who has worked with Hoyle since 1962. "It is quite a shocks," says Wickramasinghe, Sri Lankan born Professor of Applied Mathematics and Astronomy at University College, Cardiff. "From my earliest training as a scientist, I was very strongly brainwashed to believe that science cannot be consistent with any kind of deliberate creation. That notion has had to be very painfully shed. I am quite uncomfortable in the situation, the state of mind I now find myself in. But there is no logical way out of it." They did calculations based on the size and age of the universe (15 billion years) and found that the odds against life beginning spontaneously anywhere in space were '10 to the power of 30.' And as they say in their book, Evolution From Space: "Once we see that the probability of life originating at random is so utterly miniscule as to make it absurd, it become sensible to think that the favourite properties of physics on which life depends are in every respect deliberate. Wickramasinghe says: Fred was tencing much more than I towards the higher intelligence Creator. I used to argue against it, but I found myself losing every argument. At the moment I can't find any rational argument to knock down the view which argues for conversion to God. If I could have found an argument-even a filmsy one — I wouldn't have been party to what we wrote In the book We used to have open minds; now we realise that the only logical answer to life is creation, and not accidental random shuffling. I still have a hope that one day I may go back to favour a purely mechanistic explanation — I say 'hope', because I still cannot come to terms with my conversion. My being a Buddhist — albeit not an ardent one — was never a problem, because it is an atheistic religion which dosen't profess to know anything about creation and doesn't have a creator built into it. But I now find myself driven to this position by logic. There is no other way in which we can understand the precise ordering af the chemicals of the except to invoke the creations on a cosmic scale. "The two also belive that cellular life had already evolved to a high degree before the Earth was born, ebout three-and-a-half billion years ago. "We received life with the fundamental biochemical problems already solved." Says Wickramasinghe: We were hoping as scientists, that there would be a way round our conclusion — but there isn't. Logic is still hopelessly against that.

The Hindustan Times, September 6, 1981

انکار سے اقرار تک

پروفیسر چندر وکرما سنگھی (پیدائش ۱۹۲۹) شری لنکا کے ایک سائنس داں ہیں اور اس وقت **یونیورسٹی کالج**، کارڈیف (برطانیہ) میں **ریاضیات اور فلکیات** کے استاد ہیں۔ اپنے فن میں انھوں نے عالمی شہرت **حاصل** کی ہے۔ وہ پروفیسر سر فریڈ ہائل کے ساتھ ۱۹۶۲ سے ایک تحقیق میں لگے ہوئے تھے۔ تحقیق کا موضوع یہ تھا کہ زمین پر زندگی کا آغاز کس طرح ہوا۔ دونوں پروفیسروں نے اپنی تحقیق کے نتائج ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے ہیں جس کا نام ہے "**ارتقار خلا سے**"

پروفیسر وکرما سنگھی نے **تحقیق کا آغاز** اس ذہن کے ساتھ کیا تھا کہ خالق کا تصور سائنس سے غیر مطابق ہے۔ وہ لکھتے ہیں: اپنی تحقیق کے **آخری نتائج** سے مجھے بڑا دھکا لگا۔ سائنسی تعلیم کے دوران شروع سے مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ سائنس کسی بھی قسم کی ارادی تخلیق کے نظریہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتی۔ اس نظریہ کو بے حد دکھ کے ساتھ چھوڑنا پڑے گا۔ میرا ذہن مجھ کو جس طرف لے جا رہا ہے وہ میرے لئے سخت غیر اطمینان بخش ہے۔ مگر اس سے نکلنے کا کوئی منطقی راستہ موجود نہیں۔

دونوں سائنس دانوں نے الگ الگ اس کا حساب لگایا کہ اتفاقی طور پر زندگی شروع ہونے کا ریاضیاتی امکان کتنا ہے۔ دونوں کی آزادانہ تحقیق اس مشترکہ نتیجہ پر پہنچی کہ اتفاقی پیدائش کا ریاضیاتی طور پر کوئی امکان نہیں۔ انھوں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ اتفاقی پیدائش کا امکان اگر "ایک" مانا جائے تو اس کے مخالف امکانات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کو شمار کرنے کے لئے ایک کے دائیں طرف چالیس ہزار صفر لگانے ہوں گے۔ "یہ تعداد موجودہ حجم اور عمر (۱۵ بلین سال) کی کائنات میں اتنی ناقابل قیاس حد تک زیادہ ہے کہ مجھے صد فی صد یقین ہے کہ زندگی ہماری زمین پر اپنے آپ اچانک شروع نہیں ہو سکتی۔"

کیمیائی اتفاق سے اچانک زندگی کا شروع ہونا اس قدر زیادہ بعید بات ہے کہ وہ بالکل لغو معلوم ہوتا ہے۔ یہ سوچنا بالکل معقول ہے کہ طبیعیات کے وہ اوصاف جن پر زندگی کا انحصار ہے وہ ہر اعتبار سے ارادی ہیں۔ وکرما سنگھی لکھتے ہیں "سر فریڈ ہائل مجھ سے زیادہ برتر خالق کی طرف مائل تھے۔ میں اکثر اس کے خلاف ان سے بحث کرتا تھا۔ مگر میں نے پایا کہ میں استدلال کی تمام بنیادیں کھو رہا ہوں۔ اس وقت میں کوئی بھی عقلی دلیل نہیں پاتا جس سے میں خدا کے نظریہ کو باطل ثابت کر سکوں۔ اگر میں کوئی دلیل پاتا، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو تو میں اس کتاب کے لکھنے میں فریڈ کا شریک کار نہ بنتا۔ اب ہم محسوس کرتے ہیں کہ زندگی کے بارے میں واحد منطقی جواب یہی ہے کہ وہ تخلیق ہے نہ کہ کوئی الل ٹپ قسم کا الٹ پھیر۔ میں اب بھی اس امید پر ہوں کہ کسی دن میں دوبارہ خالص مشینی توجیہہ

پیش کرسکوں۔ ہم بحیثیت سائنس داں کے اس امید میں تھے کہ ہم کوئی راستہ پالیں گے۔ مگر موجودہ تحقیقی نتائج کے مطابق اس کی کوئی صورت نہیں۔ منطق اب بھی مایوسانہ طور پر اس کے خلاف ہے۔

میں ایک بدھسٹ ہوں۔ اگرچہ کوئی پرجوش نہیں۔ اس اعتبار سے یہ میرے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ کیونکہ بدھزم ایک بے خدا مذہب ہے جو اس بات کا دعویٰ نہیں کرتا کہ وہ تخلیق کے بارے میں کچھ جانتا ہے۔ بدھزم کے نظام میں خالق کا کوئی وجود نہیں۔ مگر اب میں پاتا ہوں کہ میں منطق کے ذریعہ اسی مقام پر پہنچا دیا گیا ہوں۔ اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں جس سے ہم یہ سمجھ سکیں کہ مخصوص کیمیائی مادوں میں وہ حد درجہ درست نظام کیوں کر پایا جاتا ہے جس سے کائناتی سطح پر تخلیقات کا ظہور ہو۔

تبصرہ

پچھلی صدیوں میں یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ خدا کا وجود محض ایک ذاتی عقیدہ کی چیز ہے۔ اس کا علمی طرز فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلسل ایسے شواہد مل رہے ہیں کہ انسان یہ ماننے پر مجبور ہو رہا ہے کہ خدا کا وجود ایک علمی و عقلی نظریہ ہے نہ کہ محض ایک بے دلیل عقیدہ۔

مگر سائنسی مطالعہ آدمی کو صرف اس مجرد حقیقت تک پہنچا رہا ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ اس کے آگے یہ سوال ہے کہ خدا جب ہے تو اس کا انسان سے کیا تعلق ہے۔ مگر سائنس اس کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات نہیں دیتی اور نہ دے سکتی۔ یہ دراصل وہ مقام ہے جہاں سے مذہب کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔

اصولی طور پر تمام مذاہب اس سوال کا جواب ہیں۔ مگر مذاہب کی موجودہ صورت بتاتی ہے کہ اسلام کے سوا کوئی مذہب اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں۔ کوئی مذہب اس لئے باطل قرار پاتا ہے کہ اس میں سرے سے خدا کا تصور ہی موجود نہیں۔ کسی کا حال یہ ہے کہ وہ کئی خداؤں کا مدعی ہے۔ حالاں کہ تمام علوم یہ ثابت کر رہے ہیں کہ خدا اگر ہو سکتا ہے تو ایک ہو سکتا ہے۔ کئی خدا کا ہونا ممکن نہیں۔ کسی مذہب کے نظام میں ایسے نظریات جگہ پا گئے ہیں جن کو انسانی ضمیر کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ مثلاً انسانوں کے درمیان رنگ اور نسل کی بنا پر فرق۔ اسی طرح دوسری باتیں۔

علمی حقائق انسان کو خدا تک پہنچا رہے ہیں اور خدا کو ماننے کے بعد اسلام کو ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ جب علمی مطالعہ یہ بتا رہا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے تو بے خدا مذاہب اپنے آپ باطل ثابت ہو جاتے ہیں۔ جب کائناتی تحقیق یہ بتائے کہ اس کا پورا نظام ایک وحدت کے تحت چل رہا ہے تو ایسے مذاہب بے معنی ہو جاتے ہیں جو کائنات کے کئی خدا مانتے ہوں۔ ایسی حالت میں آدمی مجبور ہے کہ وہ اسلام کو اپنا مذہب بنائے جو نہ صرف خدا کے صحیح تصور پر مبنی ہے بلکہ واضح طور پر یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا اور انسان کے درمیان کس قسم کا تعلق ہونا چاہئے۔

اور اگر تم دیکھتے جب کہ فرشتے ان منکرین کی جان قبض کرتے ہیں، مارتے ہوئے ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر، اور یہ کہتے ہوئے کہ اب جلنے کا عذاب چکھو۔ یہ بدلہ ہے اس کا جو تم نے اپنے ہاتھوں آگے بھیجا تھا اور اللہ ہرگز بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔ فرعون والوں کی طرح اور جو ان سے پہلے تھے کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا پس اللہ نے ان کے گناہوں پر ان کو پکڑ لیا۔ بے شک اللہ قوت والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ اللہ اس انعام کو جو وہ کسی قوم پر کرتا ہے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ اس کو نہ بدل دیں جو ان کے نفسوں میں ہے۔ اور بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ فرعون والوں کی طرح اور جو ان سے پہلے تھے کہ انھوں نے اپنے رب کی نشانیوں کو جھٹلایا پھر ہم نے ان کے گناہوں کے سبب سے ان کو ہلاک کر دیا اور ہم نے فرعون والوں کو غرق کر دیا اور یہ سب لوگ ظالم تھے ۵۴-۵۰

نعمت کا انحصار حالتِ استحقاقِ نعمت پر ہے۔ قومی سطح پر کسی کو جو نعمتیں ملتی ہیں وہ ہمیشہ اس استحقاق کے بقدر ہوتی ہیں جو نفسی حالت کے اعتبار سے اس کے یہاں پایا جاتا ہے۔ یہ "نفس" چونکہ فرد کے اندر ہوتا ہے اس لئے اس بات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اجتماعی انعامات کا انحصار انفرادی حالات پر ہے۔ افراد کی سطح پر قوم جس درجہ میں ہو اسی کے بقدر اس کو اجتماعی انعامات دئے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اگر خدا کے اجتماعی انعامات کو پانا چاہتا ہے تو اس کو اپنے افراد کی نفسی اصلاح پر اپنی طاقت صرف کرنا چاہئے۔ اسی طرح کوئی قوم اگر اپنے کو اس حال میں دیکھے کہ اس سے اجتماعی نعمتیں چھن گئی ہیں تو اس کو خود نعمتوں کے پیچھے دوڑنے کے بجائے اپنے افراد کے پیچھے دوڑنا چاہئے۔ کیونکہ افراد ہی کے بگڑنے سے اس کی نعمتیں چھنی ہیں اور افراد ہی کے بننے سے دوبارہ وہ اسے مل سکتی ہیں۔

جب کوئی قوم عدل کے بجائے ظلم اور تواضع کے بجائے سرکشی کا رویہ اختیار کرتی ہے تو خدا کی طرف سے اس کے سامنے سچائی کا اعلان کرایا جاتا ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائے۔ یہ اعلان کمالِ وضاحت کے اعتبار سے خدا کی ایک نشانی ہوتا ہے۔ اس کو ماننا خدا کو ماننا ہوتا ہے اور اس کو نہ ماننا خدا کو نہ ماننا۔ خدا کی دعوت جب آیت (نشانی) کی حد تک برہنہ ہو کر لوگوں کے سامنے آ جائے پھر بھی وہ اس کا انکار کریں تو اس کے بعد لازماً وہ سزا کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس سزا کا آغاز اگرچہ دنیا ہی سے ہو جاتا ہے۔ تاہم دنیا کی سزا اس سزا کے مقابلہ میں بہت کم ہے جو موت کے بعد آدمی کے سامنے آنے والی ہے۔ فرشتوں کی مار، ساری مخلوق کے سامنے رسوائی اور جہنم کی آگ میں جلنا۔ یہ سب اتنے ہولناک مراحل ہیں کہ موجودہ حالات میں ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

انسان جب ظلم اور سرکشی کا رویہ اختیار کرتا ہے تو اولاً اس کے لئے تنبیہات ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر وہ ان سے سبق نہ لے تو بالآخر وہ خدا کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ جاتا ہے۔

بے شک سب جانداروں میں بدترین اللہ کے نزدیک وہ لوگ ہیں جنھوں نے انکار کیا اور وہ ایمان نہیں لاتے۔ جن سے تم نے عہد لیا، پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ ڈرتے نہیں۔ پس اگر تم ان کو لڑائی میں پاؤ تو ان کو ایسی سزا دو کہ جو ان کے پیچھے ہیں وہ بھی دیکھ کر بھاگ جائیں، تاکہ انھیں عبرت ہو۔ اور اگر تم کو کسی قوم سے بدعہدی کا ڈر ہو تو ان کا عہد ان کی طرف پھینک دو، ایسی طرح کہ تم اور وہ برابر ہو جائیں۔ بے شک اللہ بدعہدوں کو پسند نہیں کرتا ۵۸ — ۵۵

مدینہ کے یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے خدا کی نظر میں مجرم ہو چکے تھے۔ اس جرم پر مزید اضافہ ان کی بدعہدی تھی۔ ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہود مدینہ کے درمیان یہ تحریری معاہدہ ہوا کہ دونوں ایک دوسرے کے معاملہ میں غیر جانب دار رہیں گے۔ مگر یہود خفیہ طور پر آپ کے دشمنوں (مشرکین) سے مل کر آپ کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ یہ کفر پر بدعہدی کا اضافہ تھا۔ یہ انکار کے ساتھ کمینگی کو جمع کرنا تھا۔ ایسے لوگوں کے لئے آخرت میں ہولناک عذاب ہے اور دنیا میں یہ حکم ہے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے تاکہ ان کی شرارتوں کا خاتمہ ہو اور ان کے ارادے **پست ہو جائیں**۔

اگر کسی قوم سے مسلمانوں کا عہد ہو اور مسلمان ان کی طرف سے بدعہدی کے اندیشہ کی بنا پر **اس عہد کو توڑنا** چاہیں تو ضروری ہے کہ وہ پہلے انھیں اس کی اطلاع دیں تاکہ دونوں پیشگی طور پر یہ جان لیں کہ اب دونوں کے درمیان عہد کی حالت باقی نہیں رہی۔ امیر معاویہ اور رومی حکمراں میں ایک بار میعادی معاہدہ تھا۔ معاہدہ کی مدت قریب آئی تو امیر معاویہ نے اپنی فوجوں کو خاموشی کے ساتھ روم کی سرحد پر جمع کرنا شروع کیا تاکہ معاہدہ کی تاریخ ختم ہوتے ہی اگلی صبح کو اچانک رومی علاقہ پر حملہ کر دیا جائے۔ اس وقت ایک صحابی حضرت عمرو بن عنبسہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔ وہ بآواز بلند کہہ رہے تھے اللہ اکبر اللہ اکبر وفاءٌ لا غدرٌ (اللہ اکبر، عہد پورا کرو، عہد کو نہ توڑو) انھوں نے لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث سنائی: من کان بینہ وبین قوم عہد فلا یحلن عقدۃ ولا یشدھا حتی ینقضی امدھا او ینبذ الیھم علیٰ سواء (جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو کوئی گرہ نہ کھولی جائے اور نہ باندھی جائے یہاں تک کہ معاہدہ کی مدت پوری ہو جائے یا برابری کے ساتھ عہد اس کی طرف پھینک دیا جائے (تفسیر ابن کثیر)

دوسری صورت وہ ہے جب کہ صرف اندیشہ کی بات نہ ہو بلکہ فریق ثانی کی طرف سے عملاً معاہدہ کی واضح خلاف ورزی ہو چکی ہو۔ ایسی صورت میں اجازت ہے کہ فریق ثانی کو مطلع کئے بغیر جوابی کارروائی کی جائے۔ غزوۂ مکہ اسی کی مثال ہے۔ قریش نے آپ کے حلیف (بنو خزاعہ) کے خلاف بنو بکر کی جارحانہ کارروائی میں شریک ہو کر معاہدۂ حدیبیہ کی یک طرفہ خلاف ورزی کی تو آپ نے قریش کو پیشگی اطلاع دئے بغیر ان کے خلاف خاموش کارروائی فرمائی۔

اور انکار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ وہ نکل بھاگیں گے، وہ ہرگز اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ اور ان کے لئے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمھاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمھارے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور جو کچھ تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے وہ تمھیں پورا کر دیا جائے گا اور تمھارے ساتھ کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کے لئے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمھارے لئے کافی ہے۔ وہی ہے جس نے اپنی نصرت اور مومنین کے ذریعہ تم کو قوت دی۔ اور ان کے دلوں میں اتفاق پیدا کر دیا۔ اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر ڈالتے تب بھی ان کے دلوں میں اتفاق پیدا نہ کر سکتے۔ لیکن اللہ نے ان میں اتفاق پیدا کر دیا، بے شک وہ زور آور ہے حکمت والا ہے ۶۳ — ۵۹

اسلام کا اعتماد استعمال قوت سے زیادہ مظاہرۂ قوت پر ہے۔ اسی لئے اہل اسلام کو قوت مُرہبہ فراہم کرنے کا حکم دیا گیا، یعنی وہ چیزیں جو حریف کو اس قدر مرعوب کریں کہ وہ اقدام کا حوصلہ کھو دے۔ اسلام وقت کے معیار کے مطابق اپنے کو طاقت ور بناتا ہے، مگر لازماً لڑنے کے لئے نہیں۔ بلکہ اس لئے تاکہ اس کے دشمنوں پر اس کی دھاک قائم رہے اور وہ اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کی ہمت نہ کریں۔ اسلام کو وقت کے معیار کے مطابق فکری اور عملی اعتبار سے طاقت ور بنانے میں جو لوگ اپنی کمائی خرچ کریں گے وہ کئی گنا زیادہ مقدار میں اس کا بدلہ اپنے رب کے یہاں پائیں گے۔

اسلام کی فتح کا راز اصلاً جنگی مقابلوں میں نہیں بلکہ اس کے اصولوں کی تبلیغ میں ہے۔ اس لئے حکم ہوا کہ جب بھی فریق ثانی صلح کی پیش کش کرے تو ہر اندیشہ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کو قبول کر لو۔ کیونکہ اندیشہ بہرحال یقینی نہیں اور جنگ بندی کا یہ فائدہ یقینی ہے کہ پر امن فضا میں اسلام کا دعوتی عمل شروع ہو جائے اور اس طرح جنگ کا رکنا اسلام کی نظریاتی توسیع کا سبب بن جائے۔

اسلام خود اپنی ذات میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ خدا اور آخرت کا عقیدہ اگر پوری طرح کسی گروہ کے افراد میں پیدا ہو جائے تو ان کے اندر سے وہ تمام نفسیاتی خرابیاں نکل جاتی ہیں جو نا اتفاقی اور باہمی ٹکراؤ کا باعث ہوتی ہیں۔ اس کے بعد لازماً ایسا ہوتا ہے کہ وہ سب کے سب باہم جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے۔ متحد گروہ اگر تعداد میں کم ہو تب بھی وہ اپنے سے زیادہ تعداد رکھنے والے گروہ پر غالب آجائے گا۔

باہمی اتفاق سب سے زیادہ مشکل چیز ہے کسی گروہ کے نصرت یافتہ ہونے کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کے افراد باہم متحد رہیں، کوئی بھی چیز ان کے اتحاد کو توڑنے والی ثابت نہ ہو۔

اے نبی تمھارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ مومنین جنھوں نے تمھارا ساتھ دیا ہے۔ اے نبی مومنین کو لڑائی پر ابھارو۔ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سو ہوں گے تو ہزار منکروں پر غالب آئیں گے، اس واسطے کہ وہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔ اب اللہ نے تم پر سے بوجھ ہلکا کر دیا اور اس نے جان لیا کہ تم میں کچھ کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں سو ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے، اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے ۶۶-۶۴

اہل ایمان کی کم تعداد غیر اہل ایمان کی زیادہ تعداد پر غالب آنے کی وجہ یہ بتائی کہ اہل ایمان کے اندر فقہ ہوتی ہے جب کہ غیر اہل ایمان فقہ سے محروم ہیں۔ فقہ کے لفظی معنی سمجھ کے ہیں۔ اس سے مراد وہ بصیرت اور شعور ہے جو ایمان کے نتیجہ میں ایک شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ خدا پر ایمان کسی آدمی کے لئے وہی معنی رکھتا ہے جو اندھیرے کمرے میں بجلی کا بلب جل جانا۔ بلب پورے کمرے کو اس طرح روشن کر دیتا ہے کہ اس کی ہر چیز واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ اسی طرح ایمان آدمی کو ایک ربانی شعور عطا کرتا ہے جس کے بعد وہ تمام حقیقتوں کو ان کی اصلی صورت میں دیکھنے لگتا ہے۔

ایمان کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی زندگی اور موت کی حقیقت کو سمجھ لیتا ہے۔ وہ جان لیتا ہے کہ اصل چیز حیات دنیا نہیں بلکہ حیات آخرت ہے۔ یہ چیز اس کو بے پناہ حد تک نڈر بنا دیتی ہے۔ وہ موت کو اس نظر سے دیکھنے لگتا ہے کہ وہ اس کے لئے جنت میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ مومن شہادت کو جنت کا مختصر راستہ سمجھتا ہے۔ اللہ کی راہ میں جان دینا اس کے لئے مطلوب چیز بن جاتا ہے، جب کہ غیر مومن کی جنت یہی موجودہ دنیا ہے۔ وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تاکہ اپنی جنت کا لطف اٹھا سکے۔ غیر مومن قومی شعور کے تحت لڑتا ہے اور مومن جنتی شعور کے تحت، اور قومی شعور والا کبھی اتنی بے جگری کے ساتھ نہیں لڑ سکتا۔

مومن خدا سے ڈرنے والا ہوتا ہے، وہ آخرت کی فکر کرنے والا ہوتا ہے، یہ مزاج اس کو ہر قسم کے منفی جذبات سے پاک کرتا ہے۔ وہ ضد، نفرت، تعصب، انتقام اور گھمنڈ جیسی چیزوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ دوسری طرف غیر مومن کا معاملہ سراسر اس کے برعکس ہوتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مومن کے اقدامات منفی نفسیات کے تحت ہوتے ہیں اور مومن کے اقدامات ایجابی نفسیات کے تحت۔ غیر مومن جذباتی انداز سے عمل کرتا ہے اور مومن حقیقت پسندانہ انداز سے۔ غیر مومن انسانوں کا دشمن ہوتا ہے اور مومن صرف انسانوں کی برائی کا۔ غیر مومن تنگ ظرفی کے ساتھ معاملہ کرتا ہے اور مومن وسعت ظرف کے ساتھ۔

ہزار کے مقابلہ میں سو اور دو ہزار کے مقابلہ میں ایک ہزار کے الفاظ بتاتے ہیں کہ قتال کا حکم جماعت اور فوج کے لئے ہے۔ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ایک دو آدمی ہوں تب بھی وہ لڑنے کے لئے کھڑے ہو جائیں۔

کسی نبی کے لئے لائق نہیں کہ اس کے پاس قیدی ہوں جب تک وہ زمین میں اچھی طرح خوں ریزی نہ کرلے۔ تم دنیا کے اسباب چاہتے ہو اور اللہ آخرت کو چاہتا ہے۔ اور اللہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اور اگر اللہ کا ایک لکھا ہوا پہلے سے موجود نہ ہوتا تو جو طریقہ تم نے اختیار کیا اس کے باعث تم کو سخت عذاب پہنچ جاتا۔ پس جو مال تم نے لیا ہے اس کو کھاؤ، تمہارے لئے حلال اور پاک ہے اور اللہ سے ڈرو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے ۶۷-۶۹

بدر کی لڑائی میں مسلمانوں نے ستر بڑے بڑے کافروں کو قتل کیا۔ اس کے بعد جب ان کے پاؤں اکھڑنے لگے تو ان کے ستر آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں اکثر سردار تھے۔ جنگ کے بعد مشورہ ہوا کہ ان قیدیوں کے ساتھ کیا کیا جائے۔ صحابہ کی اکثریت نے یہ رائے دی کہ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ اس وقت اسلام دشمنوں نے مسلسل حالت جنگ برپا کر رکھی تھی۔ مگر مسلمانوں کے پاس مال نہ ہونے کی وجہ سے سامان جنگ کی بہت کمی تھی۔ یہ خیال کیا گیا کہ فدیہ سے جو رقم ملے گی اس سے سامان جنگ خریدا جاسکتا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت سعد بن معاذ اس رائے کے خلاف تھے۔ حضرت عمر نے کہا: اے خدا کے رسول یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں۔ یعنی اس وقت دشمنوں کی اصل طاقت ہماری مٹھی میں آگئی ہے، ان کو قتل کر کے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی رائے پر عمل فرمایا۔

بعد کو جب وہ آیتیں اتریں جن میں جنگ پر تبصرہ تھا تو اللہ تعالیٰ نے فدیہ کی رقم کو جائز ٹھہراتے ہوئے اس روش پر اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا اگرچہ بظاہر رحمت و شفقت کا معاملہ تھا۔ مگر وہ اللہ کے دور رس منصوبہ کے مطابق نہ تھا۔ اللہ کا اصل منصوبہ کفر و شرک کی جڑ اکھاڑنا تھا۔ اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے قریش کے تمام لیڈروں کو (ابولہب اور ابوسفیان کو چھوڑ کر) بدر کے میدان میں جمع کر دیا اور ایسے حالات پیدا کئے کہ وہ پوری طرح مسلمانوں کے قابو میں آگئے۔ اگر ان لیڈروں کو اس وقت ختم کر دیا جاتا تو کفر و شرک کی مزاحمت بدر کے میدان ہی میں پوری طرح دفن ہو جاتی۔ مگر لیڈروں کو چھوڑنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منظم ہو کر دوبارہ اپنی مزاحمت کی تحریک جاری رکھنے کے قابل ہو گئے۔

یہ فیصلہ جنگی مصلحت کے خلاف تھا۔ وہ مسلمانوں کے لئے عذاب عظیم (سخت مصیبتوں) کا باعث بن جاتا۔ یہ لیڈر اپنے عوام کو ساتھ لے کر اسلام کے سارے معاملہ کو تہس نہس کر دیتے۔ مگر اللہ نے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کے لئے پہلے سے مقدر کر دیا تھا کہ وہ لازماً غالب رہیں گے، ان کو زیر کرنے میں کوئی کامیاب نہ ہو سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جنگی تدبیر میں اس کوتاہی کے باوجود قریش اہل ایمان کے اوپر غالب نہ آسکے۔ اور بالآخر وہی ہوا جس کا ہونا پہلے سے خدا کے یہاں لکھا جا چکا تھا، یعنی مسلمانوں کی فتح اور اسلام کا غلبہ۔

اے نبی تمہارے ہاتھ میں جو قیدی ہیں ان سے کہہ دو کہ اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی پائے گا تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بہتر وہ تمھیں دیدے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر یہ تم سے بدعہدی کریں گے تو اس سے پہلے انھوں نے خدا سے بدعہدی کی تو خدا نے تم کو ان پر قابو دے دیا اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۷۱ — ۷۰

بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑنا مسلمانوں کے لئے ایک جنگی غلطی تھی۔ مگر خود قیدیوں کے حق میں یہ ایک نئی زندگی فراہم کرنے کے ہم معنی تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جو اپنی مخالفتِ حق کے نتیجہ میں ہلاکت کے مستحق ہو چکے تھے ان کو ایک بار اور موقع مل گیا کہ وہ اسلام کی دعوت اور اس کے مقابلہ میں اپنی بے جا روش پر دوبارہ غور کر سکیں۔ اس مہلت نے ان کے لئے اپنی اصلاح کا نیا دروازہ کھول دیا۔

اب ایک صورت یہ تھی کہ ان قیدیوں کے دل میں شکست کی بنا پر انتقام کی آگ بھڑکے۔ فدیہ دینے کی وجہ سے ان کو جو ذلت اور نقصان ہوا ہے اس کا بدلہ لینے کے لئے وہ بے چین ہو جائیں۔ ایسی صورت میں وہ پھر اسی غلطی کو دہرائیں گے جس کے نتیجہ میں وہ خدا کی پکڑ کے مستحق بن گئے تھے۔ وہ اپنی قوتوں کو اسلام کی مخالفت میں صرف کریں گے جس کا انجام دنیا میں ہلاکت ہے اور آخرت میں عذاب۔

دوسری صورت یہ تھی کہ وہ بدر کے میدان میں پیش آنے والے غیر معمولی واقعہ پر غور کریں کہ مسلمانوں کو کم تر اسباب کے باوجود اتنی کھلی ہوئی فتح کیوں نصیب ہوئی۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خدا مسلمانوں کے دین کے ساتھ ہے نہ کہ قریش کے دین کے ساتھ۔ یہ دوسرا ذہن اگر پیدا ہو جائے تو وہ ان کو آمادہ کرے گا کہ وہ اپنی سابقہ روش کو بدلیں اور جس دین کو پہلے اختیار نہ کر سکے اس کو اب سے اختیار کر لیں۔ اور اس طرح دنیا و آخرت میں خدا کے انعام کے مستحق بنیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ قریش کے لوگوں میں ایک تعداد ایسی نکلی جن کے دل میں مذکورہ سوال جاگ اٹھا اور جلد یا بدیر وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ حضرت عباس بن عبد المطلب نے زمانہ قید ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ کچھ دوسرے لوگ بعد کو اسلام کے حلقہ میں آ گئے۔ یہ لوگ اگرچہ گروہی تعصب کی نظر میں ذلیل ہوئے مگر انھوں نے خدا کی نظر میں عزت حاصل کر لی۔ دنیا کا نقصان اٹھا کر وہ آخرت کے فائدہ کے مالک بن گئے۔

قیدیوں کو چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ وہ اس کو احسان سمجھ کر اس کا اعتراف نہیں کریں گے بلکہ پہلے کی طرح دوبارہ سازش اور تخریب کاری کا راستہ اختیار کر کے اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں گے۔ مگر قرآن نے اس اندیشہ کو اہمیت نہ دی۔ کیونکہ خالص حق کے لئے جو تحریک اٹھتی ہے وہ عام طرز کی انسانی تحریک نہیں ہوتی۔ وہ ایک خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ اس کی پشت پر خود خدا ہوتا ہے اور خدا سے لڑنا کسی کے بس کی بات نہیں۔

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا۔ اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی، وہ لوگ ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور جو لوگ ایمان لائے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمھارا رفاقت کا کوئی تعلق نہیں جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ اور وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد مانگیں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے، الا یہ کہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف ہو جس کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور جو لوگ منکر ہیں وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ پھیلے گا اور بڑا فساد ہوگا ۷۳-۷۲

عام طور پر جب ایک آدمی دوسرے کی مدد کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ آدمی اس کے اپنے خاندان کا ہے، اس سے گروہی اور جماعتی تعلق ہے۔ مگر ہجرت کے بعد مدینہ میں جو اسلامی معاشرہ قائم ہوا وہ ایسا معاشرہ تھا جس میں گھر والوں نے اپنے گھر ایسے لوگوں کو دیے جن سے تعلق کی بنیاد صرف دین تھی۔ جو لوگ اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ آئے وہ بھی اللہ کے لئے اور آخرت طلبی کے لئے آئے۔ اور جنھوں نے ان اجنبی لوگوں کو اپنے مال اور اپنی جائداد میں شریک کیا وہ بھی صرف اس لئے تاکہ ان کا خدا ان سے خوش ہو اور آخرت میں انھیں جنتوں میں داخل کرے۔

یہ ایک ایسا سماج تھا جس میں اہم چیز خاندان اور نسب نہیں بلکہ ایمان و اسلام تھا۔ وہ ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے مگر دنیوی فائدہ کے لئے نہیں بلکہ آخرت کے فائدہ کے لئے۔ وہ ایک دوسرے کو دیتے تھے مگر پانے والے سے کسی بدلہ کی امید میں نہیں بلکہ اللہ سے انعام کی امید میں۔ یہی معاشرہ حقیقۃً اسلامی معاشرہ ہے جہاں تعلقات خاندانی رشتوں اور گروہی عصبیتوں پر قائم نہ ہوں بلکہ حق کی بنیاد پر قائم ہوں۔ جہاں لوگ ایک دوسرے کے حامی و ناصر اس بنیاد پر ہوں کہ وہ ان کے دینی بھائی ہیں نہ کہ اس بنیاد پر کہ دنیوی مصلحتوں میں سے کوئی مصلحت ان کے ساتھ وابستہ ہے۔

ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے حق کے معاملہ میں مدد طلب کرے تو اس وقت اس کی مدد کرنا بالکل لازم ہے۔ اگر مسلمانوں میں باہمی مدد کی یہ روح باقی نہ رہے تو یہ ہوگا کہ شریر لوگ کمزور مسلمانوں پر دلیر ہو جائیں گے اور ان کی زندگی اور ان کے ایمان کا محفوظ رہنا سخت مشکل ہو جائے گا۔ حق کے مخالفین اپنے ساتھیوں کی مدد کے لئے انتہائی متعصب ہوتے ہیں پھر حق کے ماننے والے اپنے ساتھیوں کی مدد میں کیوں نہ سرگرم ہوں۔ اس میں استثنا صرف اس وقت ہے جب کہ معاملہ بین اقوامی ہو اور مسلمانوں کی مدد کرنا بین اقوامی پیچیدگیاں پیدا کرنے کے ہم معنی سمجھا جائے۔

"ہجرت" جنت میں داخلہ کا دروازہ ہے۔ ایک بندہ جب خدا کے ناپسندیدہ مقام سے نکل کر خدا کے پسندیدہ مقام کی طرف جاتا ہے تو دراصل وہ غیر جنت کو چھوڑ کر جنت میں داخل ہوتا ہے۔

اور جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ ان کے لئے بخشش ہے اور بہترین رزق ہے۔ اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کی اور تمھارے ساتھ مل کر جہاد کیا وہ بھی تم میں سے ہیں۔ اور خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں اللہ کے نوشتہ میں۔ بے شک اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۷۵۔۷۴

خدا پر ایمان لانا خدا کے لئے زندگی گزارنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ ایسے لوگ اکثر ان لوگوں کے درمیان اجنبی بن جاتے ہیں جو خدا کے سوا کسی اور چیز کی خاطر زندگی گزار رہے ہوں۔ یہ اجنبیت کبھی اتنی بڑھتی ہے کہ ہجرت کی نوبت آجاتی ہے۔ ماحول کی مخالفت کے نتیجہ میں پوری زندگی جدوجہد اور جاں فشانی کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک سچے مومن ہیں۔ اس کے بعد سچا ایمان ان لوگوں کا ہے جو اسلام کی خاطر برباد ہو جانے والے اس قافلہ کے پشت پناہ بنیں وہ ان کو جگہ دیں اور ان کی ہر ممکن مدد کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ جن کی زندگیاں نہیں لٹی ہیں وہ اپنا اثاثہ ان لوگوں کے حوالے کر دیں جن کی زندگیاں اسلام کی راہ میں لٹ گئی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حقیقی مسلم بننے کے لئے آدمی کو دو میں سے کم از کم ایک چیز کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی یا تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ اس طرح وابستہ کرے کہ اگر اس کو اپنی بنی بنائی دنیا اجاڑ دینی پڑے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے، آرام کی زندگی کو بے آرامی کی زندگی بنا دینا پڑے تو اس کو بھی گوارا کرلے۔ پھر یہ کہ اسلام کی خاطر جب کچھ لوگ اپنا اثاثہ لٹا دیں تو وہ لوگ جو ابھی لٹنے سے محفوظ ہیں وہ پہلے فریق کی مدد کے لئے اپنا بازو کھول دیں، حتیٰ کہ ضرورت ہو تو اپنی کمائی اور اپنی جائداد میں بھی ان کو شریک کرلیں ——— سچا ایمان کسی کو یا تو "مہاجر" بننے کی سطح پر ملتا ہے یا "انصار" بننے کی سطح پر۔

یہی دو قسم کے لوگ ہیں جن کے لئے خدا کے یہاں مغفرت اور رزق کریم ہے۔ آخرت میں آنے والی جنت انتہائی ستھری اور نفیس دنیا ہے۔ وہ ایک کامل دنیا ہے اور کامل دنیا میں بسائے جانے کے لائق وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو خود بھی کامل ہوں۔ کوئی انسان اپنی بشری کمزوریوں کی بنا پر ایسی کاملیت کا ثبوت نہیں دے سکتا۔ تاہم اللہ کا یہ وعدہ ہے کہ جو شخص مذکورہ دونوں کسوٹی میں سے کسی ایک کسوٹی پر پورا اترے گا خدا اپنی قدرت سے اس کی کمیوں کی تلافی کرکے اس کو جنت میں داخل کر دے گا۔

دین کی بنیاد پر بھائی بننے والوں کی مدد اور حمایت بے حد اہم ہے تاہم وہ رحمی رشتوں کے حقوق اور ان کے درمیان وراثتوں کی تقسیم پر اثر انداز نہ ہوگی۔ اپنی خواہش کے تحت کوئی شخص اپنے اہل خاندان کے لئے جن چیزوں کو ضروری سمجھ لے ان کی کوئی اہمیت اللہ کے نزدیک نہیں ہے۔ تاہم اللہ نے خود اپنی کتاب میں اہل خاندان کے لئے حقوق اور وراثت کا جو قانون مقرر کر دیا ہے وہ ہر حال میں قائم رہے گا۔ اور کوئی دوسری چیز اس کی ادائگی کے لئے عذر نہیں بن سکتی۔

آیاتہا ۱۲۹ سورۃ التوبہ مدنیۃ رکوعاتہا ۱۶

اعلان برارت ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین کو جن سے تم نے معاہدے کئے تھے۔ پس تم لوگ ملک میں چار مہینے چل پھر لو اور جان لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور یہ کہ اللہ منکروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اعلان ہے اللہ اور رسول کی طرف سے بڑے حج کے دن لوگوں کے لئے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں۔ اب اگر تم لوگ توبہ کرو تو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم منہ پھیرو گے تو جان لو کہ تم اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو۔ اور انکار کرنے والوں کو سخت عذاب کی خوش خبری دے دو۔ مگر جن مشرکوں سے تم نے معاہدہ کیا تھا پھر انھوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا معاہدہ ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے ۴ - ۱

موجودہ دنیا میں انسان کو رہنے بسنے کا جو موقع دیا گیا ہے وہ کسی حق کی بنا پر نہیں ہے بلکہ محض آزمائش کے لئے ہے۔ خدا جب تک چاہتا ہے کسی کو اس زمین پر رکھتا ہے اور جب اس کے علم کے مطابق اس کی مدت امتحان پوری ہو جاتی ہے تو اس پر موت وارد کر کے اس کو یہاں سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

یہی معاملہ پیغمبر کے مخاطبین کے ساتھ دوسری صورت میں کیا جاتا ہے۔ پیغمبر جن لوگوں کے درمیان آتا ہے ان پر وہ آخری حد تک حق کی گواہی دیتا ہے۔ پیغمبر کے دعوتی کام کی تکمیل کے بعد جو لوگ ایمان نہ لائیں وہ خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق کھو دیتے ہیں۔ وہ آزمائش کی غرض سے یہاں رکھے گئے تھے۔ اتمام حجت نے آزمائش کی تکمیل کر دی۔ پھر اس کے بعد زندگی کا حق کس لئے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں کے کام کی تکمیل کے بعد ان کے اوپر کوئی نہ کوئی ہلاکت خیز آفت آتی ہے اور ان کا استیصال کر دیا جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا۔ مگر ان پر کوئی آسمانی آفت نہیں آئی۔ ان کے اوپر خدا کی مذکورہ سنت کا نفاذ اسباب کے نقشہ میں کیا گیا۔ اولاً قرآن کے برتر اسلوب اور پیغمبر کے اعلیٰ کردار کے ذریعہ ان کو دعوت پہنچائی گئی۔ پھر اہل توحید کو مکہ کے اہل شرک پر غالب کر کے ان کے اوپر اتمام حجت کر دیا گیا۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا اور اس کے باوجود وہ انکار کی روش پر قائم رہے تو ان کو مسلسل خیانت اور عہد شکنی کا مجرم قرار دے کر ان کو الٹی میٹم دیا گیا کہ چار ماہ کے اندر اپنی اصلاح کر لو، ورنہ مسلمانوں کی تلوار سے تمہارا خاتمہ کر دیا جائے گا۔

پھر یہ سارا معاملہ تقویٰ کے اصول پر کیا گیا نہ کہ قومی سیاست کے اصول پر ——— مشرکین کو دلائل کے میدان میں لاجواب کر دیا گیا، ان کو پیشگی انتباہ کے ذریعہ کئی مہینے تک سوچنے کا موقع دیا گیا۔ آخر وقت تک ان کے لئے دروازہ کھلا رکھا گیا کہ جو لوگ توبہ کر لیں وہ خدا کے انعام یافتہ بندوں میں شامل ہو جائیں۔ جن بعض قبائل نے معاہدہ نہیں توڑا تھا ان کے معاملہ کو معاہدہ توڑنے والوں سے الگ رکھا گیا، وغیرہ۔

پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور بیٹھو ہر جگہ ان کی گھات میں۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو انھیں چھوڑ دو۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لئے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے ۶ - ۵

مہلت کے چار مہینے گزرنے کے بعد یہاں جس جنگ کا حکم دیا گیا وہ کوئی عام جنگ نہ تھی یہ خدا کے قانون کے مطابق وہ عذاب تھا جو پیغمبر کے انکار کے نتیجہ میں ان پر ظاہر کیا گیا۔ انھوں نے اتمام حجت کے باوجود خدا کے پیغمبر کا انکار کرکے اپنے کو اس کا مستحق بنا لیا تھا کہ ان کے لئے تلوار یا اسلام کے سوا کوئی اور صورت باقی نہ رکھی جائے۔ یہ خدا کا ایک خصوصی قانون ہے جس کا تعلق پیغمبر کے مخاطبین سے ہے نہ کہ عام لوگوں سے۔ تاہم اتمام حجت کے بعد بھی اس حکم کا نفاذ اچانک نہیں کیا گیا بلکہ آخری مرحلہ میں پھر انھیں چار ماہ کی مہلت دی گئی۔

انتقام معاف کرنا نہیں جانتا۔ انتقامی جذبہ کے تحت جو کارروائی کی جائے اس کو صرف اس وقت تسکین ملتی ہے جب کہ وہ اپنے حریف کو ذلیل اور برباد ہوتے ہوئے دیکھ لے۔ مگر عرب کے مشرکین کے خلاف جو کارروائی کی گئی اس کا تعلق کسی قسم کے انتقام سے نہیں تھا بلکہ وہ سراسر حقیقت پسندانہ اصول پر مبنی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنے شدید حکم کے باوجود ان کے لئے یہ گنجائش ہر وقت باقی تھی کہ وہ دین اسلام کو اختیار کرکے اپنے کو اس سزا سے بچا لیں اور اسلامی برادری میں عزت کی زندگی حاصل کریں۔ کسی کی توبہ کے قابل قبول ہونے کے لئے صرف دو عملی شرط کا پایا جانا کافی ہے۔ نماز اور زکوٰۃ۔

جنگ کے دوران میں دشمن کا کوئی فرد یہ کہے کہ میں اسلام کو سمجھنا چاہتا ہوں تو مسلمانوں کو حکم ہے کہ اس کو امان دے کر اپنے ماحول میں آنے کا موقع دیں اور اسلام کے پیغام کو اس کے دل میں اتارنے کی کوشش کریں۔ پھر بھی اگر وہ قبول نہ کرے تو اپنی حفاظت میں اس کو اس کے ٹھکانے تک پہنچا دیں۔ عام حکم کے تحت اگرچہ وہ گردن زدنی ہے مگر ایسا نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے دین کی بات نہیں مانی ہے تو اس کو قتل کر دیا جائے۔ جب کوئی شخص امان میں ہو تو امان کے دوران اس پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔

جنگ کے زمانہ میں دشمن کو اس قسم کی رعایت دینا انتہائی نازک ہے۔ کیونکہ عین ممکن ہے کہ دشمن کا کوئی جاسوس اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے اندر گھس آئے اور ان کے فوجی راز معلوم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اسلام کی نظر میں دعوت و تبلیغ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم ہے کہ اس نازک خطرہ کے باوجود اس کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

ایک شخص اگر بے خبری اور لاعلمی کی بنا پر ظلم کرے تو اس کا ظلم خواہ کتنا ہی زیادہ ہو مگر اس کے ساتھ ہر ممکن رعایت کی جائے گی تاوقتیکہ اس کی لاعلمی اور بے خبری ختم ہو جائے۔

ان مشرکوں کے لئے اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ کوئی عہد کیسے رہ سکتا ہے، مگر جن لوگوں سے تم نے عہد کیا تھا مسجد حرام کے پاس، پس جب تک وہ تم سے سیدھے رہیں تم بھی ان سے سیدھے رہو، بے شک اللہ پرہیزگاروں کو پسند کرتا ہے۔ کیسے عہد رہے گا جب کہ یہ حال ہے کہ اگر وہ تمھارے اوپر قابو پائیں تو تمھارے بارے میں نہ قرابت کا لحاظ کریں اور نہ عہد کا۔ وہ تم کو اپنے منھ کی بات سے راضی کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دل انکار کرتے ہیں۔ اور ان میں اکثر بدعہد ہیں۔ انھوں نے اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر بیچ دیا، پھر انھوں نے اللہ کے راستہ سے روکا۔ بہت برا ہے جو وہ کر رہے ہیں۔ کسی مومن کے معاملہ میں وہ نہ قرابت کا لحاظ کرتے ہیں اور نہ عہد کا، یہی لوگ ہیں زیادتی کرنے والے۔ پس اگر وہ توبہ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں۔ اور ہم کھول کر بیان کرتے ہیں آیات کو جاننے والوں کے لئے ۱۱-۷

مسلمانوں کو جب زور حاصل ہوگیا تو قریش نے ان سے معاہدے کر لئے۔ تاہم وہ ان معاہدوں سے خوش نہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اپنے "دشمن" سے یہ معاہدہ انھوں نے اپنی بربادی کی قیمت پر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت اس انتظار میں رہتے تھے کہ جہاں موقع ملے معاہدہ کی خلاف ورزی کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں یا کم از کم انھیں بدنام کریں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک فریق کی طرف سے اس قسم کی خیانت کا مظاہرہ ہو تو دوسرے فریق کے لئے کسی معاہدہ کی پابندی ضروری نہیں رہتی۔

یہ قریش کا حال تھا جن کو مسلمانوں کے عروج میں اپنی قیادت چھنتی ہوئی نظر آتی تھی۔ تاہم کچھ دوسرے عرب قبائل (بنو کنانہ، بنو خزاعہ، بنو ضمرہ) جو اس قسم کی نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا نہ تھے، انھوں نے مسلمانوں سے معاہدے کئے اور اپنے معاہدے پر قائم رہے۔ جب چار ماہ کی مہلت کا اعلان کیا گیا تو ان کے معاہدہ کی میعاد پوری ہونے میں تقریباً نو مہینے باقی تھے۔ حکم ہوا کہ ان سے معاہدہ کو آخر وقت تک باقی رکھو، کیونکہ تقویٰ کا تقاضا یہی ہے۔ مگر اس مدت کے ختم ہونے کے بعد پھر کسی سے اس قسم کا معاہدہ نہیں کیا گیا اور تمام مشرکین کے سامنے صرف دو صورتیں باقی رکھی گئیں یا اسلام لائیں یا جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔

معاشرتی زندگی کی بنیاد ہمیشہ دو چیزوں پر ہوتی ہے۔ رشتہ داری یا قول و قرار۔ جن سے رحمی رشتے ہیں ان کے حقوق کا لحاظ آدمی رحمی رشتوں کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اور جن سے قول و قرار ہو چکا ہے ان سے قول و قرار کی بنا پر۔ مگر جب آدمی کے اوپر دنیا کے مفاد اور اس کی مصلحت کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ دونوں باتوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیر فائدہ کی خاطر رحمی حقوق کو بھی بھول جاتا ہے اور قول و قرار کو بھی۔ ایسے لوگ حد سے گزر جانے والے ہیں۔ وہ خدا کی نظر میں مجرم ہیں۔ دنیا میں اگر وہ چھوٹ گئے تو آخرت میں وہ خدا کی پکڑ سے بچ نہ سکیں گے۔ الا یہ کہ وہ توبہ کریں اور اپنی سرکشی سے باز آئیں۔ کوئی شخص ماضی میں خواہ کتنا ہی برا رہا ہو مگر جب وہ اصلاح قبول کر لے تو وہ اسلامی برادری کا ایک معزز رکن بن جاتا ہے۔ اس کے بعد اس میں اور دوسرے مسلمانوں میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

اور اگر عہد کے بعد یہ اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمھارے دین میں عیب لگائیں تو کفر کے ان سرداروں سے لڑو۔ بے شک ان کی قسمیں کچھ نہیں، تاکہ وہ باز آئیں۔ کیا تم نہ لڑو گے ایسے لوگوں سے جنھوں نے اپنے عہد توڑ دئے اور رسول کو نکالنے کی جسارت کی اور وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ میں پہل کی۔ کیا تم ان سے ڈرو گے۔ اللہ زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ ان سے لڑو۔ اللہ تمھارے ہاتھوں ان کو سزا دے گا اور ان کو رسوا کرے گا اور تم کو ان پر غلبہ دے گا اور مسلمان لوگوں کے سینہ کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دل کی جلن کو دور کردے گا اور اللہ توبہ نصیب کرے گا جس کو چاہے گا اور اللہ جاننے والا ہے حکمت والا ہے ۱۵-۱۲

ائمہ کفر سے مراد قریش ہیں جو اپنے قائدانہ مقام کی وجہ سے عرب میں اسلام کے خلاف تحریک کی امامت کر رہے تھے۔ قریش کے اس کردار سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تحریک جب اٹھتی ہے تو اس کا پہلا مخالف کون گروہ بنتا ہے۔ یہ وہ گروہ ہے جس کو بے آمیز حق کے پیغام میں اپنی بڑائی پر زد پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وہ سرمایہ دار طبقہ ہے جس کے پاس وہ ذہن ہوتا ہے کہ وہ اسلامی دعوت میں شوشے نکال کر لوگوں کو اس کی طرف سے مشتبہ کرے۔ اسی کے پاس وہ وسائل ہوتے ہیں کہ وہ اسلام کے داعیوں کی حوصلہ شکنی کے لئے ان کو طرح طرح کی مشکلات میں ڈالے۔ اسی کے پاس وہ زور ہوتا ہے کہ وہ حق پرستوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کی تدبیریں کرے۔ حتیٰ کہ اسی کو یہ مواقع حاصل ہوتے ہیں کہ اسلام کے ماننے والوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کی آگ بھڑکا سکے۔

"ان کے عہد کچھ نہیں" بہت معنی خیز فقرہ ہے۔ جو لوگ دشمنی اور ضد کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہوں ان کے وعدے اور معاہدے بالکل غیر یقینی ہوتے ہیں۔ ان کی نفسیات میں اپنے حریف کے خلاف مستقل اشتعال برپا رہتا ہے۔ ان کے اندر ٹھہراؤ نہیں ہوتا۔ وہ اگر معاہدہ بھی کرلیں تو اپنے مزاج کے اعتبار سے اس کو دیر تک باقی رکھنے پر قادر نہیں ہوتے۔ زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ اپنے منفی جذبات سے مغلوب ہوکر وہ معاہدہ کو توڑ دیتے ہیں اور اس طرح اہل حق کو یہ موقع دیتے ہیں کہ اپنے اوپر پہل کا الزام لئے بغیر وہ ان کے خلاف مدافعانہ کارروائی کریں اور خدا کی مدد سے ان کا خاتمہ کردیں۔

تمام حکمت اور دانائی کا سرا اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کے اندر وہ شعور جگاتا ہے کہ وہ حقیقتوں کو ان کے اصلی روپ میں دیکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سے ڈرنے والے کے لئے خدائی منصوبہ کو سمجھنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ خدائی منشا کو جان کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے آپ کو اس میں لگا دیتا ہے۔ وہ اس صحیح ترین راستہ پر چل پڑتا ہے جس کی آخری منزل صرف کامیابی ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کی آنکھوں کو اشک آلود کردیتا ہے۔ مگر اللہ کے لئے بھیگی ہوئی آنکھ ہی وہ آنکھ ہے جس کے لئے یہ مقدر ہے کہ اس کو ٹھنڈک حاصل ہو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

خدا کی قدرت

ابوالعلاء المعری کا ایک شعر ہے :

تَبَارَکْتَ اَنھارُ البِلادِ سَوائِغٌ بِعَذْبٍ وَخُصَّتْ بِالملُوحَۃِ زَمْزَم

خدایا تیری برکت، دنیا کی تمام نہریں میٹھا پانی لے کر بہہ رہی ہیں اور زمزم ہی کو خاص طور پر کھاری بنا دیا گیا۔ یہ تمثیل کے انداز میں ایک بڑی گہری حقیقت کا اظہار ہے۔ دنیا کو اس کے بنانے والے نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں تمام سطحی چیزیں مزہ دار ہیں اور تمام گہری چیزیں بے مزہ ہیں۔ اگر آپ کو اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا ہو تو آپ کو غصہ اور نفرت کا کڑوا گھونٹ پینا پڑے گا جب کہ تنگ ظرفی کے لئے اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں کہ آدمی کے اندر جو تلخی یا کڑواہٹ پیدا ہو وہ اس کو دوسرے کے اوپر انڈیل دے۔ اگر آپ کو کوئی حقیقی کام کرنا ہو تو آپ کو با اصول آدمی بننے کی سختی برداشت کرنی ہوگی، جب کہ بے مقصد انسان بن کر جینے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ جہاں جیسا موقع ہو وہاں اسی روش کا مظاہرہ کر دیا جائے۔ اگر آپ کو کسی اعلیٰ مقصد کے لئے جینا ہے تو پوری زندگی پر طرح طرح کی روک لگانی پڑے گی، جب کہ بے مقصد زندگی گزارنے کے لئے صرف یہ کرنا ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو بے لگام چھوڑ دیا جائے۔

آزادی کے بعد ہندستان کی جو پہلی منتخب پارلیمنٹ بنی اس کے ایک ممبر پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ پارلیمنٹ کے ایک اجلاس میں شرکت کے بعد جب وہ دہلی سے کلکتہ کے لئے روانہ ہوئے تو ان پر ایک عجیب کیفیت گزری۔ تیز رفتار ٹرین کی فرسٹ کلاس بوگی ان کو لئے ہوئے دہلی کے جنوبی علاقہ سے گزر رہی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ ریلوے لائن کے دونوں طرف جھگی جھونپڑیوں اور گندے محلّوں کا سلسلہ ہے جو دور تک چلا گیا ہے۔ ان کو یہ سوچ کر سخت صدمہ ہوا کہ آزادی کے انقلاب نے چند خوش قسمت لوگوں کو تو بہت کچھ دیا ہے مگر کروروں عوام کے لئے اس انقلاب کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔ کلکتہ پہنچ کر انھوں نے سابق وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو کو ایک خط لکھا جس میں اپنے مذکورہ تاثر کا ذکر کرتے ہوئے یہ درج تھا کہ جب میں دہلی کی ان غریب بستیوں سے گزرا تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ یہ لوگ اگر مجھ سے پوچھیں کہ تمھاری آزادی سے ہم کو کیا ملا تو میرے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔ پنڈت نہرو نے پروفیسر ہیرن مکرجی کے اس خط کا جو جواب دیا اس کا ایک فقرہ یہ تھا : تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو :

You are paying the price of being sensitive

بے ضمیر انسان کو کروروں جھونپڑیوں کا منظر کسی پریشانی میں مبتلا نہیں کرتا۔ مگر جس شخص کا ضمیر زندہ ہو اس کو یہ گندی جھونپڑیاں اس طرح تڑپا دیں گی کہ اس کا نرم گدا اس کے لئے کانٹوں کا بستر بن جائے ——— اعلیٰ انسانیت ہمیشہ تلخ گھونٹ پی کر ملتی ہے جب کہ گھٹیا انسان بننے کے لئے سطحیت اور موقع پرستی کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

زندگی کا ساز

ایک ماہر نفسیات نے کہا ہے: مصیبت، غم اور درد ہماری زندگی کو مزید پھیلاؤ عطا کرتے ہیں۔ جو لوگ سخت مشکلیں اٹھاتے ہیں وہ زندگی کا ہر پہلو سے تجربہ کرتے ہیں۔ وہ پیالہ کو اس کی تلچھٹ تک پی جاتے ہیں جب کہ دوسرے لوگ صرف اوپر کے بلبلوں ہی کو پاتے ہیں (ریڈرز ڈائجسٹ اپریل ۱۹۸۱)

Adversity, sorrow and pain give our lives an added dimension. Those who suffer deeply touch life at every point; they drain the cup to the dregs while others sip only the pubbles on top.

ہر آدمی چاہتا ہے کہ اس کو اور اس کے بچوں کو سکھ کی زندگی ملے۔ مگر سکھ کی زندگی ہی آدمی کی سب سے بڑی قاتل ہے۔ سکھ کی زندگی آدمی کے ظاہری جسم میں کچھ رونقوں کا اضافہ ضرور کر دیتی ہے مگر ظاہری وجود کا یہ پُر رونق اضافہ صرف اندرونی وجود کی رونقوں کو ختم کرنے کی قیمت پر حاصل ہوتا ہے۔

زندگی ایک مہر بند ساز ہے۔ اس ساز کو جو چیز چھیڑتی ہے وہ غم ہے نہ کہ مسرت۔ جب آدمی غم سے دوچار ہوتا ہے تو اس کی فطرت کا ساز بج اٹھتا ہے۔ اس کے اندرونی وجود میں چھپے ہوئے نغموں کا ریکارڈ بجنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ غم سے محروم ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ڈبہ میں بند ہو کر شہر میں آیا اور اسی میں بند رہ کر واپس چلا گیا۔

ایک مغربی شاعر کا شعر ہے کہ ــــ "ہمارے سب سے زیادہ شیریں نغمے وہ ہیں جو سب سے زیادہ غمگین نغمے ہیں"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غم ناک آوازوں میں آدمی کی پوری شخصیت انڈیل اٹھتی ہے جب کہ پُر مسرت نغموں میں آدمی اپنے آپ کو صرف جزئی طور پر ہی منتقل کر پاتا ہے۔ درد مند کلام آدمی کی پوری ہستی کو چھوتا ہے اور درد سے خالی کلام صرف اس کی ہستی کے جزء کو۔

مسرت خواہ ہم کو کتنا ہی پسند ہو مگر وہ ہمارے وجود کے صرف سطحی حصہ کو چھوتی ہے جب کہ غم ہمارے پورے وجود کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہماری رگ رگ میں اتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غم کے ذریعہ آدمی اس سے زیادہ حقیقتوں کو پالیتا ہے جتنا مسرت کے ذریعہ۔

فانی بدایونی (۱۹۴۰ــ ۱۸۷۹) کے دو شعر یہاں نقل کرنے کے قابل ہیں۔

لذتِ درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم — جنس حرماں کو خدا عزت ارزانی دے

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

دو قسم کے انسان

قرآن میں ہے کہ ہر جی اپنے کئے میں پھنسا ہوا ہے (کل نفس بما کسبت رھینۃ، المدثر ۳۸) لوگ خود اپنے کئے کے حوالے کر دئے جائیں گے (اولئک الذین أبسلوا بما کسبوا، انعام ۷۰) قیامت میں لوگوں سے کہا جائے گا کہ چکھو جو تم کماتے تھے (ذوقوا ما کنتم تکسبون، الزمر ۲۴) یہی بات حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ یہ تمہارا اپنا کیا ہے جو تمہاری طرف لوٹایا جائے گا (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی ایک انڈسٹری (کارخانہ) ہے۔ مومن خدا کی انڈسٹری ہے اور غیر مومن شیطان کی انڈسٹری۔ ہر آدمی جو کچھ ہے اس کے مطابق وہ اپنی پیداوار کا ڈھیر لگا رہا ہے۔ خدا کے علم کے مطابق آدمی جب اپنے حصہ کا کام کر چکا ہوتا ہے تو اس پر موت آجاتی ہے۔ اس کے بعد اس کی اگلی زندگی شروع ہوتی ہے جہاں وہ ابدی طور پر اپنی اگائی ہوئی فصل کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جس نے کانٹوں کی فصل اگائی تھی وہ اپنے آپ کو کانٹوں میں پھنسا ہوا پاتا ہے اور جس نے پھول اور خوشبو کی فصل اگائی تھی وہ پھول اور خوشبو والے باغوں میں ہمیشہ کے لئے چلا جاتا ہے۔

انڈسٹری کیا ہے۔ انڈسٹری وہ نظام ہے جس کے اندر خام مال ڈالا جائے اور پھر وہ تیار شدہ سامان کی صورت میں برآمد ہو۔ ایک انسان وہ ہے جس کو خدا نے بڑائی دی تو اس نے تواضع کی صورت میں اس کا ردعمل پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا تو اس نے عجز کی نفسیات کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے خدا کے راستہ میں اس کا استعمال ڈھونڈ نکالا۔ اس کو مواقع ملے تو وہ ان مواقع میں اپنے آپ کو خدا کی خاطر دفن کرنے پر راضی ہو گیا۔ اس نے لوگوں کے اوپر قابو پایا تو وہ ان کے لئے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ اس نے اپنے اندر خدا کی انڈسٹری قائم کی تھی۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوئی وہ ربانی پیکر میں ڈھل کر باہر نکلی۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کی انڈسٹری سے صرف زہر اور انگارے برآمد ہوئے۔ اس کو جب موقع ملا تو اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس کو اس نے اپنی نمود و نمائش میں خرچ کیا۔ اس نے کسی کے اوپر غلبہ پایا تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے۔ اس کو کسی سے اختلاف ہوا تو اس کو اس نے زہریلے کلام اور آتشین عمل کا مزہ چکھایا۔ اس سے جب کسی کا معاملہ پڑا تو اس کو اس سے خود غرضی، بے انصافی اور دھاندلی کا تجربہ ہوا۔

ایسا آدمی گویا اپنے اندر شیطان کی انڈسٹری قائم کئے ہوئے ہے۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ زہر اور آگ اور بدبو بن کر اس کے باہر آتی ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیر لے گی۔ وہ اپنے آپ کو خود اپنے بنائے ہوئے جہنم میں پھنسا ہوا پائے گا۔

حج میں کیا نہ کریں

حج کے دنوں میں جو کچھ کرنا منع ہے وہ وہی ہے جس کو بقیہ دنوں میں بھی کرنا منع ہے۔ حج کے دوران میں ان کی ممانعت بطور تربیت ہے۔ حج میں شریعت کی ان ممنوعات پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرایا جاتا ہے تاکہ ان کے بارے میں آدمی کا احساس تیز ہو اور بقیہ دنوں میں ان سے بچنے کی خصوصی استعداد اس کے اندر پیدا ہو جائے۔

انسان جب اپنے گھر اور کاروبار میں ہوتا ہے تو وہ اپنے ذاتی معاملات میں ابھا رہتا ہے اور اس سے آگے کی حقیقتوں کو بھول جاتا ہے۔ اس لئے آدمی کو روزانہ نماز کی ادائگی کے لئے مسجد میں لایا جاتا ہے تاکہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنے ذاتی ماحول سے علیحدہ ہو اور اپنے ذہن کو غیر متعلق چیزوں سے خالی کرکے یکسوئی کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔ حج کے دنوں میں اسی مقصد کے لئے آدمی کو اس کے محدود ماحول سے نکال کر زیادہ لمبی مدت کے لئے حجاز (عرب) کے مختلف مقامات پر لے جایا جاتا ہے۔ حج کسی آدمی کے لئے اس کے دنیوی ماحول سے کامل علیحدگی کا نام ہے تاکہ وہ کامل یک سوئی کے ساتھ اپنے خدا کی طرف متوجہ ہو سکے۔

عرب کے ساتھ بہت سی عظیم دینی روایتیں وابستہ ہیں۔ اس بنا پر حج کے مراسم کی ادائگی کے لئے عرب کا جغرافیہ نہایت موزوں جغرافیہ ہے۔ یہاں کعبہ ہے جس کے بارے میں ہزاروں سال سے تقدس کی روایتیں قائم ہو چکی ہیں۔ یہاں پیغمبروں کی قربانی کی داستانیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں خدا کے نیک بندوں پر خدا کے انعامات کی یادگاریں ہیں۔ یہ وہ زمین ہے جہاں خدا کے آخری رسول اور آپ کے اصحاب کی زندگیوں کے نشانات ثبت ہیں۔ اس قسم کی تاریخی نسبتوں نے حج کے مقامات کے ساتھ غیر معمولی تقدس اور احترام کی فضا وابستہ کر دی ہے۔ یہاں کے ماحول میں پہنچتے ہی آدمی کے ذہن میں ایک پوری دینی تاریخ جاگ اٹھتی ہے۔ یہاں بالکل قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کی دینی حس میں اضافہ ہو جائے۔ وہ زیادہ سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ خدا کے مقرر کئے ہوئے فرائض کو ادا کرنے لگے۔ اسی مخصوص تاریخی اہمیت کی بنا پر اس علاقہ کو خدا نے اس کے لئے چنا کہ یہاں اسلامی زندگی کے بارے میں ایک علامتی مشق (ریہرسل) کرائی جائے اور پھر آدمی کو دوبارہ اس کے سابقہ ماحول میں واپس لایا جائے تاکہ وہ زیادہ بہتر طور پر خدا پرستانہ زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔

حج کے زمانہ میں مخصوص مراسم کی ادائگی کے دوران حاجی کے لئے جو چیزیں منع ہیں ان میں سے تین خاص چیزوں کا ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔

۱۔ زبان سے کسی شخص کو کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔

۲۔ کسی جانور کو نہ مارنا اور نہ اس کو زخمی کرنا۔

۳۔ لذت اور آرائش کی چیزوں سے پرہیز۔ مثلاً ناخن کاٹنا، بال سنوارنا، سلا ہوا کپڑا پہننا، خوشبو لگانا، ازدواجی تعلقات، وغیرہ

مل جل کر رہنے میں لوگوں کو ایک دوسرے کی جس چیز سے سب سے زیادہ سابقہ پیش آتا ہے وہ زبان ہے۔ ایک شخص کو دوسرے شخص سے سب زیادہ تکلیف زبان ہی سے پہنچتی ہے۔ حج کے زمانہ میں بیک وقت بہت سے لوگوں کا ساتھ ہو جانے کی وجہ سے بار بار یہ موقع آتا ہے کہ آدمی کی زبان بے قابو ہو جائے اور ایک مسلمان سے دوسرے مسلمان کو ٹھیس پہنچے۔ چنانچہ حج کے موسم کو خصوصیت سے اس کی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ زبان سے کسی کو تکلیف پہنچانا عام دنوں میں اسلامی اخلاقیات کا ایک جزء ہے۔ مگر حج کے دنوں میں اس کو اسلامی عبادات کا لازمی جزء بنا دیا گیا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ اہتمام کرکے اپنے کو اس سماجی برائی سے بچائیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: حج کے چند معلوم مہینے (شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ) ہیں۔ جو شخص ان مہینوں میں اپنے اوپر حج مقرر کرے تو پھر حج میں نہ کوئی فحش بات ہو اور نہ بدکلامی، اور نہ جھگڑا اور تکرار کیا جائے (بقرہ ۱۹۷) زبان سے دوسروں کو تکلیف پہنچانے کی یہی تین خاص صورتیں ہیں۔ آدمی فحش باتیں اپنی زبان سے نکالتا ہے جو دوسروں کے لئے دل خراشی کا باعث ہوتی ہیں۔ وہ دوسرے کو برے الفاظ سے یاد کرتا ہے اور اس کے بارے میں نازیبا کلمات بول کر اس کو بے آبرو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بات چیت کے دوران تکرار اور سخت کلامی پر اتر آتا ہے۔ یہ تمام چیزیں حج میں بالکل حرام کر دی گئیں۔ تاکہ ان کے بارے میں آدمی کی حساسیت بڑھ جائے اور جب وہ حج کے مقدس سفر سے لوٹے تو اس کے اثر سے اس کی زبان ہمیشہ کے لئے ان چیزوں سے محفوظ ہو چکی ہو۔

حج کے لئے احرام باندھنے کے بعد خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا حاجی کے لئے حرام ہے۔ حتیٰ کہ شکار کئے ہوئے جانور کا گوشت بطور ہدیہ قبول کرنا، پرند کا پر اکھاڑنا، شکار میں مدد دینا، شکار کے جانور کو ذبح کرنے کے لئے چھری دینا، وغیرہ سب حاجی کے لئے حرام ہیں۔

حج کے دوران میں حاجی کسی موذی جانور مثلاً سانپ کو مار سکتا ہے۔ یا وہ قربانی کے جانور کو ذبح کرتا ہے جو حج کے مراسم کا ایک جزء ہے۔ اس کے علاوہ کسی جانور کو مارنا یا اسے تکلیف دینا حرام ہے۔ جانور کا شکار عام حالات میں بالکل جائز ہے مگر حج کے دوران شکار کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ دراصل ایک شرعی حکم پر مبالغہ کے ساتھ عمل کرانا ہے۔ آدمی پر یہ فرض ہے کہ وہ انسان کو نہ مارے، وہ کسی جان دار کو نہ ستائے۔ یہ شریعت کا ایک عام حکم ہے جو ہر آدمی سے ہر حال میں مطلوب ہے، مگر حج کے دوران اس کو شکار کے جانوروں تک وسیع کر کے اس حکم کے بارے میں آدمی کے احساس کو تیز کیا جاتا ہے تاکہ حج سے واپسی کے بعد وہ زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کی تعمیل کر سکے۔

اسلامی زندگی کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھ کر زندگی گزاری جائے۔ حج کے سفر کو اس قسم کی پابند زندگی کے لئے خصوصی تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ حج کی یہ حیثیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے: جس شخص نے حج کے مراسم اس طرح ادا کئے کہ مسلمان اس کی زبان اور اس کے ہاتھ سے محفوظ رہے تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے (مَن قضیٰ نُسُکَہ وسَلِمَ المسلمون

من لسانه ویدہ کا غفر لہ ما تقدم من ذنبہ، تفسیر ابن کثیر، سورۃ البقرہ) گویا حج کا فریضہ ادا کرتے ہوئے حاجی کو جس چیز سے خاص طور پر بچنا ہے وہ یہ کہ اس کی زبان سے کسی بندۂ خدا کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔ اس کے ہاتھ سے کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچے۔ جو حج آدمی کے تمام گناہوں کو ختم کر دیتا ہے وہ وہی حج ہے جس سے آدمی اس قسم کی زبان اور اس قسم کا ہاتھ لے کر واپس آیا ہو۔

حج کے دوران لذت اور آرائش کی چیزوں کو بھی ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ حج کا عمل احرام سے شروع ہوتا ہے۔ احرام ایک سادہ لباس (ایک سفید تہمد اور ایک سفید چادر) ہے جو حرم کے حدود میں داخل ہوتے ہی ہر حاجی اور زائر کے لئے ضروری ہو جاتا ہے۔ احرام گویا ایک قسم کا فقیرانہ لباس ہے جو زیارت کعبہ کے لئے پہنا جاتا ہے۔ یہ پہلی علامتی تدبیر ہے جس کے ذریعہ سے خدا اپنے بندوں کو یہ احساس دلاتا ہے کہ سارے انسان برابر ہیں۔ جن ظاہری چیزوں کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں یا کسی کو اونچا یا کسی کو نیچا سمجھتے ہیں وہ سب خدا کی نظر میں سراسر باطل ہیں۔ خدا سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے حج کے زمانہ میں لاکھوں حاجی ایک قسم کا لباس پہننے کی وجہ سے بالکل ایک جیسے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا حج کا احرام اسلام کے اس اصول کا ایک عملی مظاہرہ ہے کہ سب انسان برابر ہیں۔ جو لوگ خدا کے اچھے بندے بننا چاہتے ہیں ان کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر قسم کے دوسرے "لباس" اپنے اوپر سے اتار دیں اور سب مل کر ایک ہو جائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ حاجی کون ہے۔ آپ نے فرمایا "پراگندہ بال اور غبار آلود" ان الفاظ میں اصلی حاجی کی تعریف بتائی گئی ہے۔ الجھے ہوئے بال اور گرد سے اٹا ہوا جسم بامقصد آدمی کی پہچان ہے۔ جب کوئی شخص پوری سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ کو کسی خاص کام کے لئے وقف کر دے تو اس کو آرائش و زیبائش کی فرصت نہیں رہتی۔ حج میں بالقصد اس قسم کا حلیہ بنانے کا حکم گویا بامقصد زندگی گزارنے کا ایک تاکیدی سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خدائی مقصد میں اپنے آپ کو اس حد تک مشغول کرے کہ اس کو اپنے ظاہر کو بنانے اور سنوارنے کی سدھ نہ رہے۔ وہ وقتی لذتوں کو بھول جائے۔ برتر مقصد کو پانے کی دھن میں اس کو اپنے ذاتی تقاضے یاد نہ رہیں۔

حج کا حکم دیتے ہوئے قرآن میں کہا گیا ہے: اور تم سفر حج میں تقویٰ کا زاد راہ لو، بہترین زاد راہ تقویٰ کا زاد راہ ہے۔ اے عقل والو اللہ سے ڈرو (بقرہ ۱۹۷)

قدیم عرب میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حج کے لئے زاد راہ لے کر نکلنا دنیا دارانہ فعل ہے، جو شخص حج کے لئے اس طرح نکلے کہ وہ دنیا کا سامان لئے بغیر حج کے سفر پر چل پڑا ہو وہ بڑا پارسا اور دین دار خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے لوگ اپنے بارے میں کہتے کہ ہم متوکل ہیں (نحن المتوکلون) ہم خدا کے سوا کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتے۔ مگر قرآن میں یہ بتایا گیا کہ اس قسم کی ظاہری نمائش کا نام دین داری نہیں ہے۔ دین داری کا تعلق دل اور ذہن سے ہے نہ کہ کسی قسم کے خارجی مظاہرہ سے۔ آدمی کو جس چیز سے بچنا ہے وہ یہ ہے کہ اس کا دل اور اس کا ذہن غیر اللہ کے ڈر سے خالی ہو، نہ یہ کہ اس کی جھولی میں کوئی کھانے پینے کا سامان نظر نہ آتا ہو۔

نوٹ: یہ تقریر ۱۴ ستمبر ۱۹۸۱ کو آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی سے نشر کی گئی۔

عمل کے نام پر بے عملی

کسی مفکر کا قول ہے کہ اپنا سفر اتنے پیچھے سے شروع کرو کہ ہر قدم اٹھانا آگے بڑھنا ہو۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اس قول کو اس طرح بدل دیا ہے ——— اپنے سفر کو اتنا آگے سے شروع کرو کہ ہر قدم اٹھانا پیچھے ہٹنا ہو۔

موجودہ زمانہ میں جو بڑے بڑے مسلم رہنما اٹھے ان کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اتنے زیادہ لوگوں نے ان کا ساتھ دیا جتنا زیادہ ساتھ دینے والے تاریخ کے کسی دور میں کسی رہنما کو نہیں ملے، حتیٰ کہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کو بھی نہیں۔ مگر ان کی بڑی بڑی تحریکیں عملی نتیجہ کے اعتبار سے قوم کو کچھ نہ دے سکیں۔ بلکہ اکثر اوقات قوم کی بربادی میں اضافہ کا باعث ہوئیں۔

اس صورت حال کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ استعداد سے زیادہ بڑا اقدام کرنا، پیچھے سے چلنے کے بجائے آگے سے چلنے کی کوشش کرنا۔ اگر آپ آغاز سے سفر شروع کریں تو کسی نہ کسی دن آپ اختتام پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن اگر آپ اختتام سے اپنا سفر شروع کرنا چاہیں تو آپ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔

ہمارے رہنما ایسے عظیم الشان اجتماعات کرنے میں مشغول ہیں جہاں سے لوگ صرف بددلی لے کر لوٹیں وہ ایسے اقدامات کر رہے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف پسپائی کی صورت میں نکلتا ہو۔ وہ ایسی اسلامی حکومتیں قائم کرتے ہیں جس کو دیکھ کر لوگ کہیں کہ اس سے زیادہ اچھی تو غیر اسلامی حکومت تھی۔ وہ ایسی اتحادی تنظیمیں بناتے ہیں جس کے بطن سے صرف اختلاف و انتشار برآمد ہو۔ وہ ایسی تاریخ ساز کانفرنسیں کرتے ہیں جو صرف تاریخ میں ایک الم ناک باب کا اضافہ کرنے کا باعث ہوں۔ وہ ایسی شان دار قیادتیں کھڑی کرتے ہیں جو صرف ایک بے شان و شوکت قوم کے کھنڈر پر وجود میں آئی ہو۔

یہ ایک بہت بڑی برائی ہے جو ہماری جدید تاریخ میں داخل ہو گئی ہے۔ ہر آدمی ایسا کام کرنا چاہتا ہے جو شان دار الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہو۔ جو اخباروں کے پہلے صفحہ کی خبر بن سکتا ہو، جس کے نتیجہ میں وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی نظروں میں آجائے۔ جو اس کو ایسے مقام پر پہنچا دے جہاں لغت کے تمام بڑے بڑے الفاظ اس کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ناکافی معلوم ہونے لگیں۔

یہ سب عمل کے نام پر بے عملی ہے، اور بے عملی سے کبھی کوئی حقیقی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ عملی نتیجہ کسی واقعی عمل سے برآمد ہوتا ہے نہ کہ عمل کے نام پر بے معنی اچھل کود سے۔

نفرت نہیں محبت

کریکٹ کے کھیل میں سب سے زیادہ کامیاب باؤلر وہ سمجھا جاتا ہے جو سب سے زیادہ تیز گیند پھینکے۔ ڈینس لیلی، (Dennis Lillee) کریکٹ کا مشہور کھلاڑی ہے۔ اس کی باؤلنگ کی رفتار ۱۴۴ کیلومیٹر فی گھنٹہ سے زیادہ ہے۔ ڈینس لیلی (پیدائش ۱۹۴۹) سے پوچھا گیا کہ تیز باؤلنگ کا راز کیا ہے۔ اس نے جواب دیا: تیز گیند پھینکنے کی حیرت ناک کوشش کو برقرار رکھنے کے لئے آپ کو عملی طور پر بیٹ والے سے نفرت کرنا ہوگا۔ میں بیٹ والوں کو چور سمجھتا ہوں جو میرے رن کو چرانے کی کوشش کر رہے ہوں:

To keep up the tremendous effort of fast bowling, you' ve practically got to hate the batsman. I think of batsman as thieves, trying to steal runs from me

Reader's Digest, June 1981, P. 48

کھیل کے میدان کا یہی اصول سیاست کے میدان میں بھی رائج ہے۔ ہر سیاسی لیڈر، شعوری یا غیر شعوری طور پر، یہ جانتا ہے کہ سیاست کو کامیاب بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ نفرت ہے۔ وہ اپنے پیروؤں میں جتنا زیادہ نفرت کا جذبہ پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ وہ سرگرمی دکھا سکیں گے اور قربانیاں دیں گے۔ اس دنیا میں وہی لیڈر کامیاب ہوتا ہے جو اپنی سیاست کے لئے کوئی ایسا بدنام نشانہ تلاش کرلے جس کے نام پر لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ نفرت کی آگ بھڑکائی جاسکتی ہو۔ موجودہ زمانہ کی تمام بڑی بڑی سیاسی تحریکیں کسی نہ کسی قابل نفرت نشانہ کے اوپر کھڑی ہوئی ہیں، کسی کا نشانہ کوئی قوم ہے، کسی کا کوئی بادشاہ اور کسی کا کوئی حکمراں۔

مگر نفرت کی بنیاد پر اٹھنے والی تحریک خدا کی نظر میں سراسر باطل ہے، خواہ وہ بظاہر مکمل اسلام ہی کے نام پر کیوں نہ اٹھی ہو۔ مخصوص اسباب کی بنا پر موجودہ زمانہ میں دنیا بھر کے مسلمان احساس مظلومی (Persecution Complex) میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ان کے درمیان جب کوئی ایسی تحریک اٹھتی ہے جو کسی مسلم دشمن طاقت کی نشان دہی کرکے اس کو مٹانے کا نعرہ دے رہی ہو تو مسلمان بہت جلد اس کے گرد جمع ہوجاتے ہیں۔ اور اگر یہ تحریک اسلام کی اصطلاحوں میں بول رہی ہو تو مسلمان اور بھی زیادہ جوش جہاد کے ساتھ اس کی طرف بڑھتے ہیں کیوں کہ ایسی صورت میں ان کو یہ اطمینان رہتا ہے کہ ان کی نفرت کی سیاست عین اسلام کی سیاست ہے نہ کہ کوئی غیر اسلامی سیاست۔ مگر یہ سراسر بھول ہے۔ اسلام کی سیاست صرف وہ ہے جو محبت اور خیر خواہی کی بنیاد پر اٹھے۔ جس کی دشمنی "کفر" سے ہو نہ کہ "کافر" سے۔ جو "شرک" کے خلاف برپا ہوئی ہو نہ کہ "مشرک" کے خلاف۔

یہ بھیڑ

پروفیسر ہنری جیکسن (Henry F. Jackson) کا ایک مضمون امریکی جرنل خارجہ پالیسی (Foreign Policy) میں چھپا ہے۔ پروفیسر جیکسن نے مصر کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ مصر میں قابل زراعت زمین تقریباً چھ ملین ایکڑ ہے۔ اس میں سے تقریباً ساٹھ ہزار ایکڑ زمین اینٹ بنانے اور پکانے والوں کے مصرف میں آکر زراعت کے لئے بے کار ہوگئی ہے۔ اسوان ڈیم کے ناکارہ ہوجانے کی وجہ سے زمین کا کٹاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔ اس قسم کی مختلف چیزوں کے نتیجہ میں ملک میں تقریباً ۲۵ فی صد قابل کار آدمی بے کار ہوگئے ہیں۔ امریکہ نے مصر کو اربوں ڈالر بطور امداد دئے ہیں مگر یہ امداد عملاً پانچ فی صد اوپر کے طبقات (فوج، بینکر، تاجر، ٹھیکہ دار، عہدہ دار) کے حصہ میں چلی گئی ہے۔ کسان گھرانے کے لوگ مقامی طور پر ذرائع معاش نہ پاکر بڑی تعداد میں شہروں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ وغیرہ

اس جائزہ کے بعد پروفیسر جیکسن لکھتے ہیں: ایسی حالت میں تعجب کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسلامی احیاء میں پناہ تلاش کر رہے ہیں، یہ ان کے لئے حکومت کی ناکام اقتصادی پالیسیوں کے خلاف احتجاج کی ایک صورت ہے:

> Is it any wonder then that more people are seeking escape in Islamic revivalism as a form of protest against the government's unsuccessful economic policies?
> The Times of India, September 8, 1981.

ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ وقت کے حکمراں کے بارہ میں مختلف وجوہ سے لوگوں کے اندر ناراضی اور عدم اطمینان موجود رہتا ہے۔ ایسی حالت میں جب حکمراں کو ہٹانے کے نام پر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اس قسم کے تمام ناراض عناصر اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوجاتے ہیں۔ یہ تمام تر ایک مصنوعی پھیلاؤ ہوتا ہے۔ یہ اجتماع "بغض معاویہ" کے جذبہ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ "حب علی" کے جذبہ کے تحت۔ مگر تحریک کے قائدین خوش فہمی میں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ سارے لوگ اسلام کے لئے سرشار ہیں، وہ خالص اسلام کو قائم کرنے کی خاطر اپنے گھروں سے نکل پڑے ہیں۔ خوش خیالی کا یہ گھروندا اس وقت بکھر جاتا ہے جب کہ "اسلام دشمن" حکمراں کو ہٹانے کی تحریک کامیاب ہوجائے۔ اسلام دشمن حکمراں کے ہٹتے ہی اسلام دوست حضرات آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ کیوں کہ ان کو جس چیز نے اکھٹا کیا تھا وہ صرف ایک منفی نشانہ تھا اور اسلام دشمن حکمراں کے ہٹنے کے بعد وہ نشانہ باقی نہ رہا۔

ماں باپ کے ساتھ سلوک

عن عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قال: سألت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای العمل احب الی اللہ قال الصلاۃ علی وقتھا۔ قلت ثم ای، قال بر الوالدین۔ قلت ثم ای، قال الجھاد فی سبیل اللہ (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب عمل کون سا ہے۔ فرمایا وقت پر نماز پڑھنا۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک۔ پوچھا اس کے بعد۔ فرمایا اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص ان رجلاً جاء الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال: جئت ابایعک علی الھجرۃ و ترکت ابوی یبکیان۔ قال ارجع الیھما فاضحکھما کما ابکیتھما (رواہ ابوداؤد)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ ہجرت پر بیعت کروں اور میں نے اپنے ماں باپ کو روتے ہوئے چھوڑا ہے۔ آپ نے فرمایا اپنے ماں باپ کی طرف واپس جاؤ اور ان کو ہنساؤ جس طرح تم نے ان کو رلایا ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال: اتی رجل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اشتھی الجھاد ولا اقدر علیہ۔ قال ھل بقی من والدیک احد۔ قال امی۔ قال قابل اللہ فی برّھا فاذا فعلت فانت حاج و معتمر ومجاھد (رواہ ابویعلی والبیھقی)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا کہ میں جہاد کی خواہش رکھتا ہوں مگر مجھے اس پر قدرت نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تمہارے والدین میں سے کوئی ہے۔ اس نے کہا میری ماں ہے۔ آپ نے فرمایا ماں کے ساتھ حسن سلوک میں خدا کو پانے کی کوشش کر۔ جب تم ایسا کروگے تو تم حاجی ہو، تم عمرہ کرنے والے ہو، تم مجاہد ہو۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یارسول اللہ من احق بحسن صحابتی قال امک۔ قال ثم من قال امک۔ قال ثم من قال امک قال ثم من قال ابوک (رواہ البخاری ومسلم)

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا کہ میری حسن صحبت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔ آپ نے فرمایا تمہاری ماں۔ پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تمہاری ماں۔ پوچھا پھر کون۔ فرمایا تمہاری ماں۔ پوچھا پھر کون آپ نے فرمایا تمہارا باپ۔

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رضا اللہ فی رضا الوالد وسخط اللہ فی سخط الوالد (رواہ الترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کی رضامندی باپ کی رضامندی میں ہے اور اللہ کی ناراضی باپ کی ناراضی میں ہے۔

الجنۃ تحت اقدام الامھات (الجامع الصغیر للسیوطی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے

تاریک اجالے

احمد اور طبرانی نے حضرت عائشہ کی ایک روایت مختلف الفاظ میں نقل کی ہے۔ بعد کے زمانہ میں حضرت عائشہ نے ایک شخص کو وہ احوال بتائے جو ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہل خاندان پر گزرے تھے۔ انھوں نے ایک رات کو ٹٹول کر کام کرنے کا ذکر کیا۔ اس کے بعد روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فقلت یا ام المومنین علی مصباح۔ قالت لو کان عندنا دھن غیر مصباح لاکلناہ

(الترغیب والترہیب، جلد ۵)

راوی کہتے ہیں۔ میں نے حضرت عائشہ سے چراغ کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے جواب دیا: اگر ہمارے پاس چراغ جلانے کے لئے تیل ہوتا تو چراغ جلانا تو درکنار ہم اس کو بھوک کی وجہ سے پی جاتے۔

ہجرت کے بعد جس بستی کو مدینۃ الرسول اور مدینہ طیبہ کا لقب ملا وہاں اس وقت ایک بھی پکا مکان نہ تھا۔ مسجد نبوی بس ایک بڑا سا چھپر تھی جس کو چاروں طرف سے مٹی اور کھجور کے پتوں سے گھیر دیا گیا تھا۔ مسجد میں رات کے وقت روشنی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلایا گیا ہے۔ پہلا شخص جس نے مدینہ کی مسجد نبوی میں رات کو چراغ جلایا وہ تمیم داری ہیں۔ تمیم داری نے ۹ھ میں اسلام قبول کیا ہے اس وقت مکہ فتح ہو چکا تھا اور تقریباً سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔

جب مسلمانوں کے پاس اپنے گھروں کو روشن کرنے کے لئے چراغ نہ تھے اور مسجد میں رات کے وقت اندھیرا رہتا تھا تو اسلام اور مسلمانوں کو دنیا میں عزت و غلبہ حاصل تھا۔ آج مسلمانوں کے گھر روشن ہیں۔ ان کی مسجدیں جدید طرز کے قمقموں سے جگمگا رہی ہیں مگر دنیا میں اسلام کا غلبہ نہیں، مسلمانوں کو کہیں عزت حاصل نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عزت و غلبہ کا مقام حاصل کرنے کے لئے اصل اہمیت انسان کی ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں کے یہاں سب کچھ ہے مگر وہی چیز نہیں جس کو "انسان" کہا جاتا ہے۔ اسلامی دنیا مردہ روحوں کا ایک عظیم قبرستان معلوم ہوتی ہے جہاں روشنیوں کی رونقیں اور در و دیوار کی عظمتیں تو بہت ہیں مگر وہ انسان نہیں جو خدا کے لئے تڑپے، جو سچائی کے آگے جھک جائے، جو آخرت کی خاطر اپنی دنیا کو قربان کر سکے، جو اپنی خواہشوں کو برتر اصولوں کے تابع کر دے۔ اسلام کو سربلند کرنے کے لئے وہ انسان درکار ہیں جن کو عظمت خداوندی کے احساس نے پست کر رکھا ہو، جن کا خوف آخرت ان سے ان کی اکڑ چھین لے۔ اور یہی وہ انسان ہیں جو اسلام کے بھرے ہوئے شاندار پنڈال میں آج کہیں موجود نہیں۔

خود کفیل زندگی

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان من الذنوب ذنوبا لا تکفرھا الصلاۃ ولا الصیام ولا الحج ولا العمرۃ ولکن یکفرھا الھمّ فی طلب المعیشۃ (رواہ ابن عساکر وابو نعیم فی الحلیۃ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: گناہوں میں کچھ گناہ ایسے ہیں جن کو نماز اور روزہ اور حج اور عمرہ دور نہیں کرتے ان کو دور کرنے والی چیز معاش کے حصول کی فکر کرنا ہے۔

اس حدیث میں گناہ سے مراد وہ نفسیاتی کمزوریاں ہیں جو اکثر معاشی ذرائع کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً بخل، حسد، تنگ ظرفی، وعدہ خلافی وغیرہ۔ انسانوں میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو حالات سے بے نیاز ہو کر اعلیٰ اخلاق کا ثبوت دے سکیں۔ مگر ایسے لوگ ہمیشہ بہت کم پائے گئے ہیں۔ بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ مال ان کے لئے اخلاقی مددگار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر ان کے پاس مال ہو تو وہ فیاضی کا ثبوت دیں گے اور اپنی مالی ذمہ داریوں کو بخوبی طور پر ادا کریں گے۔ لیکن اگر وہ مال سے خالی ہو جائیں تو ان کا دل چھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ تعلقات میں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت نہیں دے پاتے۔ ان کے ذمہ لوگوں کے جو مالی حقوق ہوں ان کی ادائگی میں ان سے کوتاہیاں سرزد ہوتی ہیں۔

کوئی شخص اپنے اندر اس قسم کی کمی پائے تو وہ روزہ اور نماز کی زیادتی سے اس کو ختم نہیں کر سکتا۔ ایک شخص جو مالی مشکلات سے دوچار ہو اس کے اندر چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ چڑچڑا پن ایک ایسی اخلاقی کمزوری ہے جو بہت سی دوسری اخلاقی کمزوریوں کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے جب آدمی اپنے اندر اس قسم کی کیفیت محسوس کرے تو اس کو چاہئے کہ اللہ کے بھروسہ پر معاش کے حصول کی جد وجہد میں لگ جائے۔ معاشی فراغت حاصل ہوتے ہی اس کا چڑچڑا پن خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح جو شخص مالی مشکلات میں مبتلا ہو اس کے اندر پست ہمتی آجاتی ہے اور پست ہمتی بہت سی دوسری خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اس لئے جب آدمی اپنے اندر اس قسم کی علامت دیکھے تو اس کو چاہئے کہ معاش کی جد وجہد میں اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دے۔ معاش کے حصول کے بعد خود بخود ایسا ہو گا کہ اس کا پستی کا مزاج جاتا رہے گا۔ اسی طرح جو شخص مال کی کمی کے مسئلہ سے دوچار ہو اس کے اندر "دینے" سے زیادہ "لینے" کا مزاج پیدا ہو جاتا ہے جو بہت سی دوسری خرابیوں کو اپنے ساتھ لاتا ہے۔ اس لئے جو شخص اپنے اندر اس قسم کی کمزوری دیکھے وہ اپنے کو اس قابل بنانے کی کوشش شروع کر دے کہ وہ لوگوں سے لئے بغیر اپنی ضروریات پوری کر سکے۔ جب ایسا ہو گا تو خود بخود اس کی اصلاح ہو جائے گی۔

تقویٰ نہ کہ شور وغل

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ مکہ کے مشرکین مسجد حرام کے والی بننے کے لائق نہیں۔ اس کے والی تو صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو متقی ہیں۔ مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اور ان مشرکین کی نماز کعبہ کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں کہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں بجانا۔ پس عذاب چکھو اپنے انکار کے سبب سے (انفال ۳۵-۳۴)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مکہ کے مشرکین خانہ کعبہ میں جمع ہو کر صرف سیٹیاں اور تالیاں بجاتے تھے، اس کے سوا کچھ اور نہیں کرتے تھے۔ وہ دراصل اپنے دعوے کے مطابق ابراہیم اور اسماعیل کی عبادت کرتے تھے۔ البتہ انھوں نے اس عبادت پر تالیوں اور سیٹیوں کا اضافہ کر لیا تھا۔ یہ چیزیں ان کی کل عبادت نہ تھیں بلکہ ان کی اصل عبادت کا جزء تھیں۔ جیسا کہ آج بھی گمراہ فرقوں اور قوموں میں عبادت کے ساتھ ساتھ تالی پیٹنے اور گھنٹی اور ناقوس بجانے کا رواج ہے اور ان چیزوں کو وہ اصل عبادت کا ضروری حصہ سمجھتے ہیں۔ قرآن نے مشرکین کے عبادتی مراسم کو تالی اور سیٹی کے تابع کر دیا اور تہدیدی انداز میں کہا کہ انھوں نے سیٹی بجانے اور تالی پیٹنے کو عبادت سمجھ لیا ہے۔ حالاں کہ عبادت تقویٰ کا نام ہے نہ کہ کسی قسم کا شور وغل کرنے کا۔

مشرکین مکہ کا طریقہ یہ تھا کہ جب وہ کعبہ کا طواف کرتے تو نیم برہنہ ہو جاتے۔ وہ کعبہ کے گرد اسی طرح گھومتے تھے جس طرح آج کوئی حاجی گھومتا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ کرتے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں باندھ کر اس میں پھونکتے جس سے سیٹی کی سی آواز نکلتی (انھم کانوا یطوفون بالبیت عراۃ وھم مشبکون بین اصابعھم یصفرون فیھا ویصفقون، تفسیر نسفی) اسی طرح جب وہ نماز پڑھتے تو وہ بھی عام نمازیوں کی طرح سجدہ میں جاتے مگر اس وقت وہ اپنے رخسار زمین پر رکھ دیتے اور اسی کے ساتھ تالیاں بجاتے اور کلمات عبادت کی ادائگی کے ساتھ دوسری آوازیں نکالتے (انھم کانوا یضعون خدودھم علی الارض ویصفقون ویصفرون، تفسیر ابن کثیر)

موجودہ زمانہ میں عبادتی مواقع پر جس طرح لاؤڈ اسپیکروں کا شور بلند ہوتا ہے اور جس طرح دھوم دھام کے ساتھ دینی تقریبات منائی جاتی ہیں ان پر بھی قرآن کے یہ الفاظ پوری طرح صادق آتے ہیں۔ ان مواقع پر اگرچہ حسب قاعدہ کچھ عبادتی افعال بھی کیے جاتے ہیں مگر ان کی عبادت پر ان کے ہنگامے اس طرح غالب رہتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر ایک دردمند شخص کہہ اٹھے گا:

"انھوں نے شور وغل کو اسلام سمجھ لیا ہے"

پانے کے لئے کھونا پڑتا ہے

طبرانی نے کعب بن عجرہ سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک روز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ آپ کا چہرہ متغیر ہے، میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان کیوں میں آپ کو اس حال میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: میرے پیٹ میں تین دن سے وہ چیز داخل نہیں ہوئی جو کسی جگر والے کے پیٹ میں داخل ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نکلا تو میں نے دیکھا کہ ایک یہودی اپنے اونٹ کو پانی پلا رہا ہے۔ میں نے اس کی مزدوری کی اور ایک ڈول کے بدلے ایک کھجور کی اجرت پر اس کے لئے پانی کھینچا۔ ان کھجوروں کو لے کر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے پوچھا: من این لک یا کعب (اے کعب یہ کھجوریں تم کو کہاں ملیں) میں نے پورا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا: اے کعب کیا تم مجھ سے محبت رکھتے ہو۔ میں نے کہا: میرے ماں باپ آپ پر قربان ہاں۔ آپ نے فرمایا: کوئی بندہ جب اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے تو محتاجی اس کی طرف اس سے بھی زیادہ تیزی سے آتی ہے جیسے سیلاب اپنے بہاؤ کی طرف (ما من عبد یحب اللہ ورسولہ الا الفقر اسرع الیہ من جریۃ السیل علی وجھہ)

دنیوی مصلحتیں رکاوٹ بن جاتی ہیں

نجران (یمن) کا عیسائی وفد ہجرت کے دسویں سال مدینہ آیا۔ اس کے لمبے قصہ میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ مدینہ سے واپس ہوتے ہوئے ان کا بڑا پادری ابوحارثہ بن علقمہ خچر پر سوار تھا۔ خچر نے ایک مقام پر ٹھوکر کھائی۔ پادری زمین پر گر پڑا۔ پادری کا بھائی کرز بن علقمہ جو ساتھ تھا، اس کی زبان سے نکلا تَعِسَ الْاَبعد۔ ابعد سے اشارہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا، یعنی محمد کا برا ہو۔ پادری نے فوراً کہا: تعست امک (تمھاری ماں کا برا ہو) کرز بن علقمہ نے تعجب سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کہا۔ پادری نے جواب دیا: واللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ یہی وہ نبی منتظر ہیں جن کی بشارت ہماری کتابوں میں دی گئی تھی۔ کرز بن علقمہ نے یہ سن کر کہا: پھر آپ لوگ اس کی نبوت کا اقرار کیوں نہیں کرتے۔ پادری نے کہا:

لِاَنَّ ھٰؤلاء الملوک اعطونا اموالا کثیرۃ	کیونکہ یہ بادشاہ ہم کو کافی مال دیتے ہیں اور ہماری
واکرمونا فلو آمنا بمحمد لاَخذوا منا کل	عزت کرتے ہیں۔ اگر ہم محمد کی نبوت کو مان لیں تو یہ ساری
ھٰذہ الاشیاء (محمد بن اسحٰق بحوالہ تفسیر رازی)	چیزیں وہ ہم سے واپس لے لیں گے۔

فرض سے آگے بڑھ کر قربانی دینا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بدر کے لئے نکلے۔ روحاء پہنچ کر آپ نے قیام کیا اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا، آپ نے پوچھا: کیف ترون (تمھاری کیا رائے ہے) پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا۔ مگر آپ نے التفات نہیں فرمایا (فالرض عنہ) اور دوبارہ فرمایا "تمھاری کیا رائے ہے"۔ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اٹھے۔ مگر آپ نے التفات نہیں فرمایا، اور پھر کہا "تمھاری کیا رائے ہے"۔ اب سعد بن معاذ

انصاری رضؓ اٹھے۔ انھوں نے کہا: واللہ لکانک تریدنا یارسول اللہ (خدا کی قسم شاید آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے اے خدا کے رسول) آپ نے فرمایا "ہاں"۔ اصل یہ ہے کہ انصار نے آپ سے بیعت نصار کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ مدینہ میں آپ کی حفاظت کریں گے۔ مگر باہر (بدر) جاکر دشمنوں سے لڑنا اس بیعت میں شامل نہ تھا۔ اس لئے ان سے پوچھنا ضروری تھا۔ مقداد بن عمرؓ نے کہا:

اذا لا نقول لک یارسول اللہ کما قال قوم موسیٰ لموسی علیہ السلام اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون (البدایہ والنہایہ)

اس وقت ہم آپ کو اس طرح نہیں کہیں گے جس طرح موسیٰؑ کی قوم نے موسیٰؑ سے کہا تھا (تم اور تمہارا رب جاکر لڑے ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے)

سعد بن معاذؓ نے کہا: ہم آپ سے عہد کر چکے ہیں کہ ہم آپ کی سنیں گے اور آپ کی اطاعت کریں گے۔ اے خدا کے رسول! چلئے جس چیز کا بھی آپ کا ارادہ ہو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے، اگر آپ ہم کو حکم دیں کہ ہم اپنی سواریاں سمندر میں گھسا دیں تو ہم ان کو سمندر میں گھسا دیں گے۔ اگر آپ حکم دیں کہ ہم اپنی اونٹنیوں کو برک غماد (یمن) تک لے جاتے ہوئے ان کا کلیجہ چھلنی کریں تو ہم ایسا ضرور کریں گے۔ ہمارا ایک آدمی بھی پیچھے نہ رہے گا۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی اس تقریر سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا چلو۔ اللہ نے تمہارے لئے فتح و نصرت کا فیصلہ کر دیا ہے۔

زندگی اس کے لئے ہے جو موت سے نڈر ہو جائے

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے ایک بار اسلامی سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضؓ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: اے خالد، موت کے شیدائی بن جاؤ تم کو زندگی مل جائے گی (یا خالد احرص علی الموت توھب لک الحیاۃ)

دین وہی ہے جو آدمی کے اندر گہری تبدیلی پیدا کرے

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اے ابوہریرہ، پرہیزگار بنو تم سب سے زیادہ عبادت کرنے والے ہو جاؤ گے۔ قانع بنو تم سب سے زیادہ شکر کرنے والے بن جاؤ گے۔ اور لوگوں کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو تم ایمان والے ہو جاؤ گے۔ اپنے پڑوس والوں کے ساتھ بہتر پڑوسی بن کر رہو تم اسلام والے ہو جاؤ گے۔ اور ہنسی کم کر دو کیونکہ زیادہ ہنسنا دلوں کو مردہ کرتا ہے (یا ابا ھریرۃ کن ورعا تکن اعبد الناس، وکن قنعا تکن اشکر الناس، واحب للناس ما تحب لنفسک تکن مؤمنا واحسن جوار من جاورک تکن مسلما، واقل الضحک فان کثرۃ الضحک تمیت القلوب، ابن ماجہ)

توبہ نام ہے اپنے کئے پر پچھتانے کا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا التوبۃ الندم یعنی توبہ یہ ہے کہ آدمی نے جو کچھ کیا ہے اس پر اس کو شرمندگی ہو۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیاء اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکری اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱- الاسلام	۱۵-۰
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۱۵-۰
۳- ظہورِ اسلام	۱۵-۰
۴- دین کیا ہے؟	۲-۰
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۵-۰
۶- تجدیدِ دین	۳-۰
۷- اسلام دینِ فطرت	۳-۰
۸- تعمیرِ ملت	۳-۰
۹- تاریخ کا سبق	۳-۰
۱۰- مذہب اور سائنس	۵-۰
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۳-۰
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۲-۰
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۱-۰
۱۴- تعارفِ اسلام	۲-۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۲-۰
۱۶- راہیں بند نہیں	۳-۰
۱۷- دینی تعلیم	۳-۰
۱۸- ایمانی طاقت	۳-۰
۱۹- اتحادِ ملت	۳-۰
۲۰- سبق آموز واقعات	زیرِ طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۳-۰
۲۴- زلزلۂ قیامت	۴-۰
۲۵- سچا راستہ	۱-۰

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ مِلتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ ۱۴ جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوت حاصل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

ہمدرد

HD-5949 AU

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 59
OCTOBER 1981

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231